۶ نکات کی سچی تصویر

الطاف حسن قریشی

مکتبۂ اردو ڈائجسٹ ۔ سمن آباد ۔ لاہور

انتساب

محبوب وطن کے نام!

جس میں بوالہوسی نے سر اُٹھایا ہے

اور اہل دل، جنوں کو کارِ زیاں سمجھ بیٹھے ہیں۔

سرِ مژگاں

چھ نکات کا غبارہ جذباتی فضا سے نکل کر سنجیدہ غور و فکر کے خلا میں داخل ہو چکا ہے۔ عوام کے سامنے چھ نکات کا صرف ایک رُخ آیا اور دُوسرا رُخ نہایت مدّھم اور دھندلا تھا۔ تین برس پہلے مجھے مشرقی پاکستان کے سیاسی اور فکری پس منظر میں چھ نکات کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع ملا۔ اگر اس وقت اربابِ اقتدار اس تجزیے کی طرف دھیان دیتے، تو مشرقی پاکستان کی سیاسی صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی۔

آج بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے مسائل کا حل وہی ہے جو تین برس پہلے تجویز کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعے سے آپ شدّت سے محسوس کریں گے کہ جن خدشات اور خطرات کا اس وقت ذکر کیا گیا تھا، وہ بالکل اسی شکل و صُورت میں نمودار ہوئے۔ کاش! اقتدار کی آنکھیں کُھلی ہوتیں۔ کتنا اچّھا ہو اگر ہماری بند آنکھیں اب بھی کُھل جائیں۔ ڈر ہے چند ماہ یا چند برس بعد وقت ہمیں کفِ افسوس ملنے کی بھی فرصت نہ دے گا۔ خُدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔

مشرقی پاکستان

کا

فکری اور سیاسی پس منظر

مَیں ڈھاکے میں چھ دن رہا اور تقریباً ہر قابلِ ذکر حلقے میں گھومتا پھرا۔ ہوٹلوں میں بیٹھا، فٹ پاتھ پر چلنے والے راہ گیروں سے باتیں کیں، صحافیوں کے جلوت کدوں میں گیا، وکلاء کے چیمبر دیکھے، سیاستدانوں کے نہاں خانۂ دل میں چپکے سے گھس گیا اور کان لگا کر باتیں سُنیں، یونیورسٹی کے طلباء سے ملا اور ان سے مستقبل کے پروگرام معلوم کیے، اسمبلی میں لفظوں کے معرکے دیکھے اور ان عزائم کو بھی دیکھنے کی کوشش کی جو اراکین کے سینوں میں پرورش پا رہے ہیں۔ سرکاری افسروں سے ڈرتے ڈرتے ملا اور ان کی باتیں کانپتے کانپتے سُنیں، پولیس کے قریب بھی جانے کی ہمت کی اور بخیر و عافیت واپس آ گیا۔ کچھ ایسے حلقے بھی دیکھے جن کا ذکر شاید میں ابھی نہ کر سکوں۔ ان تمام حلقوں سے جو معلومات حاصل کیں۔ اور ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ میری یہ کوشش قوم کے کسی کام آئے۔

ڈھاکہ تیزی سے ایک صنعتی شہر بنتا جا رہا ہے۔ نرائن گنج، تیج گاؤں اور ٹونگی میں بڑی بڑی صنعتیں ہیں ان کارخانوں میں بلامبالغہ پچاس ساٹھ ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ آدم جی جوٹ مل ½ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے اور اپنے سینے میں بڑے بڑے انقلابات کی داستانیں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ نیا ڈھاکہ اونچی اونچی عمارتوں میں گھرا ہوا ہے۔ موتی جھیل کی نئی نئی عمارتیں کاروباری ترقیوں کی طرف سر

اٹھاکر اشارے کر رہی ہیں، ڈھاکے کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی پر ان ترقیوں کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں، یہ اثرات انتہائی خاموش، لیکن حد درجہ گہرے ہیں۔

پہلا اثر یہ ہے کہ ڈھاکے میں رہنے والوں کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر بدلتا جا رہا ہے، اب وہ قدرے مادیت کی طرف جا رہے ہیں، آپ کسی سے مل لیجیے، وہ روپے پیسے کی بات ضرور کرے گا۔ کوئی لائسنس اور پرمٹ حاصل کرنے کی فکر میں ہے، کوئی مکان بنانے کا پروگرام بنا رہا ہے، کوئی نئی صنعت کے قیام کے امکانات پر غور کر رہا ہے، جس کے پاس سرمایہ نہیں، وہ حکومت کو برا بھلا کہہ رہا ہے۔ یہ تمام باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اہلِ ڈھاکہ ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اور یہ پہلو بہت ہی خوش آئند ہے، تاہم بعض مواقع پر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر زندگی سر تا پا مادیت بن جائے، تو اس کا اصل رنگ روپ کچھ پھیکا پڑ جاتا ہے، اور پھر اسے میک اپ کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا اثر یہ نظر آتا ہے کہ چونکہ صنعت کاری کا عمل بہت دیر سے شروع ہوا، اس لیے اکثر تیار شدہ چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ یہ گرانی اخبارات کے ذریعے پھیل کر ہر ذہن پر مسلط نظر آتی ہے، اور لوگوں میں خاصا اضطراب پایا جاتا ہے۔ اس اضطراب کو کچھ دوسرے عوامل اور زیادہ شدید بنا رہے ہیں۔

گرانی کا آپ بھی کچھ اندازہ کر لیجیے۔

نئے ڈھاکے میں تین کمروں کا مکان تین سو، ساڑھے تین سو روپے سے کم کرائے پر نہیں ملتا، کہتے ہیں اب کرائے کم ہو گئے ہیں، ورنہ ایک سال پہلے وہ مکان پانچ سو روپے پر اٹھتا تھا۔ امریکیوں نے کرایے زیادہ دینے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا تھا۔ انہیں بھلا کیا تکلیف ہوتی۔ امریکی امداد کو دونوں ہاتھوں سے واپس بھی تو لینا تھا۔

انجینیروں سے معلوم ہوا کہ ڈھاکے میں مکان بنوانے پر لاگت بھی بہت زیادہ آتی ہے۔ یہاں انیٹیں ۱۳۰ روپے اور ۱۴۵ روپے ہزار ہیں، سیمنٹ کا بیگ گیارہ روپے میں ملتا ہے۔ مزدوری بھی خاصی گراں ہے۔ چونکہ مشرقی پاکستان کے حصے میں زمین کم آئی ہے، اس لیے زمین کے قطعات بھی اونچے

داموں پر اُٹھتے ہیں۔

کھانے پینے کی چیزیں کراچی کے مقابلے میں یقیناً مہنگی ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ گندم کا آٹا روپے سیر، چاول ایک روپیہ ۱۲ پیسے کا سیر ملتا ہے۔ دیہات میں گندم کا آٹا دو روپے سیر ہے۔ ڈھاکے میں راشن ہے، موٹا چاول ۶۶ پیسوں کا سیر ملتا ہے۔ گندم کا آٹا ۵۶ پیسے فی سیر مہیا کیا جاتا ہے۔ گندم ایک چھٹانک فی کس دی جاتی ہے۔ مزدوروں کو راشن میں چاول زیادہ دیا جاتا ہے۔

لکڑی کی کرسیاں، جن کی لکڑی مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتی ہے، لاہور کے مقابلے میں پندرہ پندرہ، بیس بیس روپے زیادہ مہنگی ہیں۔ میں نے پھل، پان اور سوتی ساڑھیوں کے سوا اور کوئی چیز کراچی اور لاہور کے مقابلے میں ارزاں نہیں پائی، بعض درآمد شدہ چیزیں بھی سستی مل جاتی ہیں۔

شہر میں مقامی آمد و رفت کے تین ذرائع ہیں: (۱) موٹر ٹیکسیاں (۲) سکوٹر رکشا جنہیں وہاں بے بی ٹیکسی کہتے ہیں (۳) سائیکل رکشا۔ یہ تینوں بڑے گراں ہیں۔ موٹر ٹیکسی کبھی میٹر پر نہیں چلے گی اور قریب سے قریب جگہ کے بھی دو تین روپے وصول کر لیے جائیں گے۔ سکوٹر رکشا کی بھی یہی کیفیت ہے، بہت کم ڈرائیور میٹر کو حرکت میں لاتے ہیں، اور فاصلہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، وہ ایک روپیہ ضرور وصول کر لیں گے سائیکل رکشا والے غربت اور مفلوک الحالی کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں، اسے دیکھتے ہوئے آپ کی جیب سے از خود ایک روپے کا نوٹ نکل آئے گا۔

نئے ڈھاکے کی حسین و جمیل عمارتوں کے پہلو بہ پہلو خستہ جھونپڑیاں اور ٹین کے شکستہ مکانات نظر آتے ہیں۔ یہ تضاد معاشرتی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ جب سب کا معیارِ زندگی ایک جیسا تھا تو کوئی احساس نہ ابھرتا ہوگا لیکن اب بلندیاں پستیوں کا منہ چڑا رہی ہیں۔ آدمی اور تو سب کچھ برداشت کر لیتا ہے، لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کا منہ چڑائے۔ بس اب سب ایک دوسرے کا منہ چڑا رہے ہیں، ان کے پوز انتہائی ماڈرن اور سائنٹیفک ہیں۔

اس صنعتی ترقی کا یہ پہلو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ڈھاکے میں اس قسم کی بے راہروی نظر نہیں

آتی جو کراچی کا مقدر بن چکی ہے، شاید کوئی ہاتھ تقدیر کی لکیروں کو بدل دے۔ ڈھاکے میں آپ کو شبینہ کلبیں نظر نہیں آتیں۔ ایک دو ہیں، مگر ان میں وہ خرافات بہت کم ہیں، جو ان کا لازمی حصہ سمجھے جاتے ہیں؛ البتہ ایک طبقہ ایسا ابھر رہا ہے جو رندِ خرابات بنتا جا رہا ہے۔ اس میں مختلف عناصر شامل ہیں اب ان کی کیا پردہ دری کروں۔

کارخانوں میں اَن گنت خواتین کام کرتی ہیں، لیکن وہ اپنے آپ کو پُرکشش بنانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ سوتی کپڑے کی سفید ساڑھیوں میں وہ کچھ معصوم سی نظر آتی ہیں۔ سانولے چہرے پر بلا کا وقار ہوتا ہے شام کے وقت خواتین کے غول کے غول بہت کم دکھائی دیتے ہیں، ڈھاکے کی معاشرتی زندگی کو جنسی اعتبار سے پاکیزہ بنانے میں خواتین کا بہت بڑا حصہ ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ڈھاکے کی شامیں علمی اور ثقافتی تقریبوں سے بہت کم آراستہ ہوتی ہیں۔ کوئی ایسی مرکزی جگہ نظر نہیں آتی جہاں شہر کے اہلِ دانش جمع ہو کر فکری اور بنیادی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں۔ علمی اور ادبی محفلیں مزاج میں توازن اور نظر میں وسعت پیدا کرتی ہیں، اور انسان کو اعلیٰ مقاصد کے لیے جینا سکھاتی ہیں۔ ادیبوں کی تنظیم، رائٹرز گلڈ کا دفتر سُونا پڑا ہے۔ محمد پور میں گاہے گاہے گلشنِ ادب کی محفلیں جمتی ہیں، لیکن اسے مرکزی حیثیت حاصل نہیں، پاکستان کونسل کے منتظمین خاصے فعّال ہیں، مگر وہ بھی خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے، وہاں رکھ رکھاؤ زیادہ ہے اور صرف وہی لوگ سرگرمی سے حصہ لے سکتے ہیں، جنھیں دانشوری کا سرٹیفکیٹ حاصل ہو۔ یونیورسٹی سے ذہنی اور فکری چشمے پھوٹ سکتے ہیں۔ مگر وہاں کی تو فضا ہی کچھ اور ہے۔ اب کوئی ذہنی اور روحانی تشنگی بجھانے کہاں جائے، فکری غذا مناسب مقدار میں نہ ملنے کی وجہ سے اذہان یا تو مرجھاتے جا رہے ہیں، یا ان میں انتشار بڑھ رہا ہے نوجوان نسل پاکستان کی آئیڈیالوجی سے بڑی حد تک بے خبر ہے، شاید اس لیے کہ اسے کسی نے واضح اور دلنشیں انداز میں پاکستان کا مقصدِ وجود بتایا ہی نہیں۔ کبھی کبھار کے مذاکروں سے کیا ہوتا ہے؟ جب مقصد ہی کی خبر نہ ہو، تو عمل میں نظم و ضبط اور استقلال کہاں سے آئے گا؟ ذہنی پیاس پڑھے لکھے طبقے میں بڑھتی

جارہی ہے۔ مجھ سے متعدد طلبا نے ایسے سوالات کیے جن سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے ذہنوں میں متصادم فکری لہریں دوڑ رہی ہیں، اور وہ کشمکش سے نجات پاکر ایک واضح راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

تہذیبی اقدار کا تسلسل ٹوٹتا جارہا ہے۔ درسی کتابیں آبائی میراث کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اب اگر ایسے علمی اور تہذیبی ادارے بھی کثرت سے نہ ہوں جو تہذیبی روایات کا چرچا عام کرسکیں تو آپ خود ہی بتائیے وہ تہذیب کب تک زندہ رہے گی، اور نوجوانوں میں تہذیب و ثقافت کو عملی زندگی میں جذب کرلینے کا شعور و جذبہ کیونکر پھوٹے گا۔

اسلام یہاں کی جذباتی زندگی میں رچا بسا ہے۔ صرف ڈھاکے میں چھ سو مسجدیں ہیں، ان مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد، لاہور کی مسجدوں سے یقیناً زیادہ ہے۔ قرآن کی تلاوت کا دستور بھی عام ہے۔ میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یومِ ولادت نبویؐ کی تقریبِ سعید پر شہر کی فضا کتنی اعلیٰ اور کتنی پاکیزہ تھی۔ عشق و جذب میں ڈوبی ہوئی درود و صلوٰۃ کی صدائیں قلوب و اذہان کو ایک انجانا سا سرور اور ایک لطیف سا کیف عطا کررہی تھیں، یہ روح پرور مناظر اس ایقان کو تقویت پہنچا رہے ہیں کہ جب تک پاکستان کے دونوں بازوؤں میں رہنے والے محسنِ عظیمؐ سے والہانہ محبت کرتے رہیں گے، اس وقت تک ان کے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکنا بند نہیں کریں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے یہ بے پناہ محبت چند موقعوں اور چند مقامات تک محدود ہے، حالانکہ محبت حدود کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ غالباً ابھی یہ تصور واضح نہیں ہے کہ اسلام ایک نظامِ زندگی، ایک دستورِ حیات اور ایک مربوط فلسفۂ زیست ہے۔ یہ جس طرح ایک مسلمان سے مسجد میں خدا کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کا تقاضا کرتا ہے، بالکل یہی تقاضا وہ زندگی کے ہر شعبے میں، ہر مقام اور ہر دور راہے پر کرتا ہے۔ معاشرت کے مسائل ہوں یا سیاست کا میدان، بین الاقوامی معاملات ہوں یا پرائیویٹ زندگی کے چھپے ہوئے گوشے، اسلام قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے اور وہ اپنے حلقہ بگوش کو کسی مقام پر بھی بے آسرا اور بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ میں نے اکثر لوگوں سے گفتگو کے دوران یہ محسوس کیا کہ ان کے

اذہان اسلام کے اس ہمہ گیر تصور سے خالی ہیں، اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بنگلہ زبان میں ایسا لٹریچر نہ ہونے کے برابر ہے جو اسلام کو ایک فکری تحریک اور تہذیبی انقلاب کی حیثیت سے پیش کرتا ہو۔

بدقسمتی سے اخبارات کا رویہ اسلامی نظامِ حیات کے بارے میں خاصا معاندانہ ہے۔ بارہ روزہ قیام کے دوران میں میں نے ایک آدھ اخبار کے سوا، اسلام کا ایک لفظ تک نہیں دیکھا، بلکہ ایسے اداریے اور ایسی خبریں ضرور نظر سے گزریں جو اسلام کے نظامِ اقدار کو غلط رنگ میں پیش کر رہی تھیں۔ مارننگ نیوز میں اسلامی تاریخ اور عظیم شخصیتوں پر مضامین چھپتے رہتے ہیں، لیکن اخبار کا باقی حصّہ ان اثرات کو زائل کر دینے کے لیے کافی ہے جو ان مضامین کو پڑھنے کے بعد مرتب ہو سکتے تھے۔

اخبارات و رسائل کے اس طرزِ عمل اور صحت مند تہذیبی سرگرمیوں کے تعطّل کی وجہ سے نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عام مسلمانوں میں اسلام کے لیے جو محبّت پائی جاتی ہے، وہ زندگی کے معاملات میں روز بروز بے اثر ہوتی جا رہی ہے۔ اس قوّت کے کمزور پڑنے سے ان مفاسد کو سر اُٹھانے کا موقع مل رہا ہے جو پاکستان کی بقا کے لیے سخت خطرناک ہیں۔

مَیں نے متعدّد اہم شخصیتوں سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک قیامِ پاکستان کی جدّوجہد کس مقصد کے حصول کے لیے کی گئی تھی۔ اکثریت کا جواب یہ تھا کہ پاکستان کی تحریک کے پیچھے معاشی محرّک تھا۔ میں نے کہا: 'پھر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مابین کیا چیز قدرِ مُشترک رہ جاتی ہے، جب کہ آپ لوگ دو معیشت کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ کچھ اہلِ دانش نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ اگر اسلام کو سیاسی طاقت حاصل ہو گئی، تو مُلّاؤں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ مجھے ان کی یہ بات سُن کر حد درجہ حیرت ہوئی۔ ایک جمہوری نظام میں کسی ایک ایسے طبقے کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع کیسے مل سکتا ہے جو زندگی کے ہر میدان میں شکست کھا کر مسجد اور مدرسے میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔

اس حقیقت کو جانتے ہوئے کہ اسلام ہی دونوں بازوؤں کو متحد رکھ سکتا ہے۔ کسی بڑی سیاسی

جماعت نے اپنے مقاصد میں یہ شق نہیں رکھی کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے! جماعت اسلامی، اسلامی نظام کا پروگرام لے کر اٹھی ہے، لیکن اس کا سیاسی اثر بہت محدود ہے، اور سچ پوچھیے، تو وہ بھی دین اور سیاست میں توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ عید میلاد النبیؐ کے موقع پر اس جماعت نے بھی کوئی بڑا جلسہ نہ کیا۔ آخر لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ سیاسی جماعتیں دینی کام بھی کر سکتی ہیں، اور دینی جماعتیں سیاست کا مفہوم بھی سمجھتی ہیں۔

اہل ڈھاکہ کے رہن سہن کے چند پہلو خاصے دلچسپ ہیں۔ نمود و نمائش نہ مردوں میں ہے اور نہ عورتوں میں۔ لاکھوں میں کھیلنے والا بھی دھوتی اور چپل میں نظر آئے گا۔ طلبہ اور سرکاری افسروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا، آپ کسی کو انگریزی لباس میں نہیں دیکھیں گے۔ یہی سادگی گھر کی ہر چیز سے ٹپکتی ہے۔ یہاں کے لوگ چارپائیوں پر نہیں سوتے، بلکہ اس مقصد کے لیے وہ لکڑی کی چوکیاں بنوا لیتے ہیں۔ بعض چوکیاں تو اتنی لمبی چوڑی ہوتی ہیں کہ اس پر پورا خاندان سو سکتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جس علاقے میں لکڑی اور پٹ سن کی فراوانی ہو، وہاں چارپائیوں کا استعمال بہت کم ہو۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بڑی وجہ چھوٹے چھوٹے مکانات ہیں۔ ان مکانات میں چارپائیوں کے لیے جگہ نکل ہی نہیں سکتی۔

درمیانے درجے کے گھروں میں آپ کو فرنیچر نظر نہیں آئے گا، لیکن جن گھرانوں میں روپے پیسے کی ریل پیل ہے، وہ فرنیچر کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ بعض گھروں میں تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے مکینوں نے اپنی دوسری ضروریات کو کاٹ کر فرنیچر کا خاص طور سے اہتمام کیا ہے۔ فرنیچر کا خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ڈھاکے میں بکرے کا گوشت، مرغی کے گوشت سے زیادہ مہنگا ہے۔ اپنے مہمانوں کو مرغی کھلانا پسند نہیں کرتے، سوچیے تو سہی کیا غضب کرتے ہیں؟

نغمہ و موسیقی کی دھیمی دھیمی سُریں مکانات سے پھوٹتی ہیں، اور دل میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر جاتی ہیں،

یہاں برسات کی رِم جھم سے جلترنگ بجتے ہیں، یہاں کی ندیاں گنگناتی ہیں، یہاں کی فضا نغمہ ریز ہے، اور یہ سارے نغمے سازوں میں ڈھل کر رُوح و وجدان میں جذب ہوجاتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھا گیا: مغربی پاکستان میں رقص و موسیقی پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ موسیقی نہ ہو تو رُوح بجھ جاتی ہے، تم کس طرح زندہ رہوگے؟ میں نے اُن سے ہنستے ہوئے کہا: رُوح تو خود ایک نغمہ ہے، ضمیر خود ایک آہنگ ہے، دل کی دھڑکن خود ایک ٹوٹا ہوا ساز ہے، اسے بیرونی نغموں کی کیا ضرورت؟

یہاں مغربی پاکستان کے رقص و موسیقی والے آرڈیننس کے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا ہے۔ کالج کی ایک طالبہ نے شرماتے ہوئے آہستہ سے کہا: "اگر موسیقی پر پابندی عائد کردی گئی، تو ہم سے شادی کون کرے گا؟ تم لوگ تو کرنے سے رہے۔" ایک ایڈیٹر صاحب نے میز پہ مُکّے مارتے ہوئے کہا: "ہم اپنے صوبے میں کرامویل کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔" کئی اخبارات نے اس آرڈیننس کے خلاف طویل اِداریے لکھے اور مغربی پاکستان کی حکومت کے رجعت پسندانہ اقدام پر خوب لعن طعن کی۔ اب اکثر اخبارات کا رویّہ یہ ہے کہ ہر اُس خبر اور ہر اس بات کی تشہیر کرتے ہیں جس سے آرڈیننس کے خلاف فضا تیار ہوتی ہو۔ میرے قیام کے دوران سلامت علی اور نزاکت علی ڈھاکہ آئے اور انہوں نے پریس کلب میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بعض اخبارات میں یہ خبر پہلے صفحے پر تین کالمی سُرخیوں کے ساتھ چھپی۔ ان فنکاروں سے ایک انٹرویو لیا گیا اور ان کی زبان سے یہ بات کہلوائی گئی کہ مغربی پاکستان میں موسیقی پر جو پابندی عائد ہوئی ہے، وہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ اس اقدام سے لوگوں کی ذہنی نشوونما رُک جائے گی، اور وہ فن دم توڑ دے گا جو ہماری ثقافت کا جزوِ لاینفک ہے۔

میں جب لاہور سے چلا تھا، میرے تصوّر میں یہ تھا کہ ڈھاکے میں سورج ایک گھنٹہ پہلے طلوع ہوتا ہے، وہاں کاروبارِ حیات بھی ایک گھنٹہ پہلے شروع ہوجاتے ہوں گے مگر یہاں تو معاملہ کچھ اور دیکھا۔ یہاں کی عدالتیں دس گیارہ بجے لگتی ہیں۔ صوبائی سرکاری دفاتر بھی دس بجے سے پہلے نہیں کھلتے۔ البتہ مرکزی دفاتر کے اوقات سات بجے ہیں، لیکن ملازم وقت پر کم ہی پہنچتے ہیں۔ فرموں کے دفاتر بھی دیر

سے کھیلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ یہاں کی آب و ہوا کا اثر ہے۔ میری ملاقات ایک ایسی خاتون سے ہوئی جو دو سال ہوئے لاہور سے ڈھاکہ آ کر آباد ہو گئی ہیں، انہوں نے انتہائی حسرت آمیز لہجے میں کہا:

"مجھے لاہور کی لوئیں بہت یاد آتی ہیں۔"

یہاں لوگ شادی کے انتظار میں عمریں نہیں گنوا دیتے، عموماً بیس پچیس سال کی عمر میں شادی ہو جاتی ہے اور تیس برس کی عمر ہونے تک آدمی سات آٹھ بچوں کا باپ بن جاتا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے ماہرین جہاد میں مصروف ہیں، مگر یہاں اس کا وہ زور شور سُنائی نہیں دیتا جو لاہور اور کراچی میں ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖

اب میں ڈھاکہ کے سب سے نازک مسئلے کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے پورے مشرقی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اور اس کے عمل اور ردِ عمل کے دائرے بہت وسیع ہیں۔ میں اس مسئلے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کانپ رہا ہوں، کیونکہ ذمّے داری کا احساس دل کا کانٹا بنا ہوا ہے۔ یہ مسئلہ سیاسی مسئلہ ہے۔ میرے تجزیے کے مطابق یہاں کی سیاسی زندگی پانچ عناصر سے مرکّب ہے۔

۱ : سیاسی جماعتیں۔

۲ : وُکلا۔

۳ : صحافی۔

۴ : طلبہ۔

۵ : مزدوروں کی انجمنیں۔

میں اختصار کے ساتھ ہر عنصر کا جائزہ لیتا ہوں۔

کبھی مشرقی پاکستان میں سترہ سے زیادہ سیاسی جماعتیں تھیں، لیکن اب سات بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی لیگ، جماعت اسلامی، مسلم لیگ کونسل، نظام اسلام

اور نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ۔

پاکستان مسلم لیگ کو اسمبلی میں بظاہر بھاری اکثریت حاصل ہے، لیکن یہ عوام میں ایک نئی رُوح اور ایک تازہ جذبہ پھونکنے میں ناکام رہی۔ صوبائی صدر اور سیکرٹری دو وزیر ہیں، شاید یہ بات بھی اسے عوامی سطح پر لانے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ اس کی تنظیم نو کا کام شروع ہو چکا ہے۔ عین ممکن ہے اس میں نیا خون داخل ہو۔ لوگوں کا عام تاثر یہ ہے کہ اس جماعت میں مختلف الخیال لوگ جمع ہیں، اور آپس میں شدید اختلافات رکھتے ہیں اور یہی اختلافات اُسے غیر مؤثر بناتے جا رہے ہیں، اگر یہ جماعت اپنی ذِمّے داریاں محسوس کرے، تو یہ سیاسی زندگی میں خوشگوار انقلاب لا سکتی ہے۔

نیشنل عوامی پارٹی، جس کے سربراہ مولانا بھاشانی ہیں، دو واضح گروپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک گروپ کی ہمدردیاں چین کے ساتھ ہیں۔ یہ گروپ مولانا بھاشانی کا گروپ ہے، دوسرا گروپ اپنے آپ کو روس کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ اس کے قائد پروفیسر مظفر احمد ہیں۔ سب سے زیادہ سیاسی کارکن اسی جماعت کے پاس ہیں، لیکن اندرونی کشمکش اسے کھوکھلا کیے دے رہی ہے۔ صوبائی خود مختاری کا گونج دار نعرہ سب سے پہلے اسی جماعت نے لگایا تھا۔ اور اس پر بڑی شدت سے مُصر ہے۔

عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمن ہیں، وہ پابندِ سلاسل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت جمہوری طریقے پر کام نہیں کر رہی اور سارے اختیارات شیخ مجیب الرحمن میں مرتکز ہو گئے ہیں۔ شیخ صاحب ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کرتے ہیں، تو ان ممبروں کو نہیں بلاتے جو ان سے اتفاق نہیں رکھتے۔ شاہ عزیز الرحمن نائب صدر ہیں، لیکن ورکنگ کمیٹی کے اجلاسوں کی انہیں اطلاع نہیں ملتی۔ عوامی لیگ میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ مزدور تنظیموں پر اس جماعت کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔

مشرقی پاکستان کی صوبائی جماعتِ اسلامی کے امیر عبد الرحیم صاحب ہیں۔ یہ چھوٹی سی جماعت بہت منظم ہے اور واضح آئیڈیالوجی کے لیے کام کر رہی ہے۔ نظریاتی جماعت ہونے کی وجہ سے اس میں مشنری سپرٹ پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ ابھی اتنی مختصر ہے کہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر پائی، تاہم

فعال ہے اور اپنی پشت پر مضبوط لٹریچر رکھتی ہے۔ مزدوروں میں رفاہی کام کر رہی ہے۔

مسلم لیگ کونسل زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ تذبذب اور انتشار اس کی صفوں سے عیاں ہے۔ اس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس مسلسل ملتوی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ صرف موہوم امیدوں پر زندہ ہے۔

نظام اسلام کے مشرقی پاکستان میں قابلِ ذکر ممبر، جو اس جماعت کے جنرل سیکرٹری ہیں، مولوی فرید احمد ہیں۔ فرید احمد صاحب سے پہلے ہم مولانا اطہر علی خاں کا نام سنا کرتے تھے۔ کہتے ہیں مولوی فرید احمد صاحب، مولانا کو بے دست و پا بنا کر آگے بڑھے ہیں۔ صدارتی انتخابات سے پہلے اس جماعت کے پاس کچھ ورکرز تھے، لیکن وہ ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔

نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ اس لیے وجود میں آیا تھا کہ کسی سیاسی جماعت کو زندہ نہیں ہونے دے گا، مگر اب وہ خود سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کے تمام سابق نامور سیاستدان اس کے ممبر ہیں۔ نور الامین، عطاء الرحمٰن، حمید الحق چودھری، ابو حسین سرکار، یہ سب اس کے دماغ ہیں۔ اگر اسے لیڈروں کی جماعت کہا جائے، تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ وہ قائدین کرام ہیں جن کی ماضی میں، ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی رقابتیں رہی ہیں۔ اس پس منظر میں اس فرنٹ سے مثبت کردار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

سیاسی پارٹیوں اور وکلاء میں گہرا تعلق ہے۔ اکثر سیاسی لیڈر قانون دان ہیں۔ نور الامین، عطاء الرحمٰن خاں، حمید الحق چودھری، ابو حسین سرکار، مولوی فرید احمد، اختر الدین احمد، ابو منصور احمد، تفضل حسین، شاہ محمد عزیز الرحمٰن، عزیز الحق، ظہیر الدین، یہ ممتاز وکلاء میں سے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بار ایسوسی ایشن اور بار کونسل میں سیاسی اثرات غالب ہیں۔ یہ وکلاء اپنی سیاسی پارٹیوں کے لیے کام کرتے ہیں، اور اس طرح سیاسی جماعتیں اور وکلاء ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جو بھی سیاسی تحریکیں چلتی ہیں۔ ان میں قانون دان پیش پیش ہوتے ہیں۔

اس سے بھی گہرا تعلق سیاسی جماعتوں اور اخبارات میں پایا جاتا ہے۔ ڈھاکے کا ہر اخبار کسی

نہ کسی جماعت سے علانیہ تعلق رکھتا ہے۔ مغربی پاکستان میں ایسا نہیں۔ یہ اخبارات نہ صرف اپنی پارٹی کے پروگرام کی نشر و اشاعت کرتے ہیں، بلکہ ان کے لیے پروگرام بھی بنا کر دیتے ہیں۔ مجھے ایسے صحافیوں کا علم ہے جو اپنی اپنی پارٹیوں کے لیے دماغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اخبارات کی سیاسی زندگی پر گرفت اتنی سخت ہے کہ کوئی سیاسی جماعت ان کے پیدا کیے ہوئے ماحول سے ہٹ کر کام نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر اخبارات آٹھ دس برس سے صوبائی خود مختاری کا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین عدم مساوات کے واقعات کو پانچ پانچ اور چھ چھ کالمی سُرخیوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ اب کسی سیاسی جماعت کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنے پروگرام میں ان دو نکات کو شامل نہ کرے۔ اخبارات میں اسلام کے خلاف جو اعتراضات اُٹھتے رہتے ہیں ان سے خائف ہو کر کوئی بڑی سیاسی جماعت اِسلام کا نام تک نہیں لیتی۔

مختلف اخبارات کی پوزیشن یہ ہے:

پاکستان آبزرور

یہ حمید الحق چودھری صاحب کا اخبار ہے۔ نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کی پالیسیوں کی حمایت کرتا ہے اور بنگلہ قومیت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹر عبدالسّلام صاحب بہت پرانے صحافی ہیں، مُلّا ازم کے سخت مخالف ہیں۔ اس کی اشاعت بیس ہزار کے لگ بھگ ہو گی۔

مارننگ نیوز

اب یہ نیشنل ٹرسٹ کا پرچہ ہے۔ بدرالدین صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں، صحت مند ذہن کے مالک ہیں۔ یہ گورنمنٹ کی پالیسیوں کی تشہیر کرتا ہے، کبھی کبھار تنقید بھی۔ اس اخبار کے عملے میں ایسے اصحاب بھی ہیں جو بنگلہ قومیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی اشاعت ۳۰/۲۵ ہزار بتائی جاتی ہے۔

اتفاق

یہ بنگلہ رُوزنامہ ہے، آجکل حکومت نے بند کر رکھا ہے۔ اس کی اشاعت سب سے زیادہ

بتائی جاتی ہے۔ صدارتی انتخابات کے زمانے میں تیس پینتیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ عوامی لیگ کا ترجمان ہے۔ اس کے ایڈیٹر تفضل حسین ہیں۔ بنگلہ قومیت کا زہر پھیلانے میں یہ پیش پیش رہا ہے۔ امریکہ کی حمایت کرتا ہے۔

ڈیلی پاکستان (روزنامہ پاکستان)

یہ بنگلہ پرچہ نیشنل پریس ٹرسٹ نے دو تین برس پہلے جاری کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں میں مقبول ہوتا چلا گیا۔ اس کے ایڈیٹر شمس الدین صاحب ہیں۔ اس روزنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام سیاسی جماعتوں کی خبریں یکساں اہمیت کے ساتھ دیتا ہے۔

سنگ باد

بنگلہ کا یہ روزنامہ نیشنل عوامی پارٹی کے اس گروپ کی حمایت کرتا ہے جو روسی خیالات کا ترجمان ہے۔ اس کے ایڈیٹر زہیر۔ ایچ چودھری ہیں۔

پیغام

اس کے متعلق عوام میں تاثر یہ ہے کہ گورنر صاحب کا پرچہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر مجیب الرحمٰن خاں ہیں۔ یہ خالص پاکستان مسلم لیگ کا ترجمان نظر آتا ہے ــــ اشاعت کچھ زیادہ نہیں۔

آزاد

اس کے ایڈیٹر مولانا اکرم خاں ہیں۔ ان کی ہمدردیاں کونسل مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے اخبار پر ان کا کنٹرول مؤثر نہیں رہا۔ اور اب یہ اخبار بھی بنگلہ قومیت کو ہوا دے رہا ہے۔

پاسبان

ڈھاکہ سے شائع ہونے والا یہ اکلوتا اردو اخبار ہے۔ اس کے ایڈیٹر حسن مصطفےٰ ہیں۔ یہ روزنامہ حکومت کی حمایت کرتا ہے۔ اس کی اشاعت دو تین ہزار سے زیادہ نہیں۔

یہ پہلو بھی خاصا اہم ہے کہ جناب حمید الحق چودھری تین اخبارات اور رسائل کے مالک ہیں:

پاکستان آبزرور، چیترالی اور انصاف۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ان اخبارات میں مغربی پاکستان کی خبریں دو فی صد بھی نہیں ہوتیں۔
سیاست کا چوتھا بڑا جز طلبہ ہیں۔ طلبہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو جو طالب علم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر یا سیکرٹری بنے، وہی آگے چل کر سیاسی جماعتوں کے فعّال لیڈر قرار پائے چونکہ سیاسی جماعتوں کے پاس کارکنوں کی بہت کمی ہے، اس لیے ان کی نظریں ہر بڑے معاملے کے لیے طلبہ پر اُٹھتی ہیں، یہ سیاسی جماعتیں نعرے کچھ اس انداز سے لگاتی ہیں کہ طلبہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اگر انہوں نے فوری حصّہ نہ لیا، تو خدانخواستہ پاکستان کا وجود باقی نہ رہے گا۔

ہر بڑی سیاسی جماعت نے طلبہ کے ایک حصّے پر قبضہ جما رکھا ہے۔ لُطف کی بات یہ کہ کوئی سیاسی جماعت اس بات کا اعتراف نہیں کرتی، بلکہ دوسری سیاسی جماعتوں پر الزام لگاتی ہے کہ وہ طلبہ کو باقاعدہ پیسے دیتی ہیں۔ میری معلومات کے مطابق طلبہ مندرجہ ذیل کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تنظیمیں مشرقی پاکستان بنیادوں پر ہیں۔

۱ : ایپسو۔ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن ــ یہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبہ کی بڑی تنظیم ہے، اور نیپ کی حمایت کرتی ہے۔ آجکل دو گروہوں میں تقسیم ہے، ایک کی قیادت عبدالجبار خاں صاحب (سپیکر قومی اسمبلی) کے صاحبزادے مینن موتیا کر رہے ہیں۔ دوسرے گروپ پر ایک خاتون چودھری کا قبضہ ہے ــ یہ دونوں کسی نہ کسی بہانے یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔

۲ : این۔ ایس۔ ایف ــ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ یہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی دوسری بڑی تنظیم ہے اور حکومت کی پالیسیوں کی حمایت کرتی ہے۔

۳ : ای۔ پی۔ ایس۔ ایل ــ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ۔ یونیورسٹی میں اس کی تیسری پوزیشن ہے۔ یہ عوامی لیگ کی ہمنوا ہے۔ اس کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

۴ : اسلامی چھاترو شنگھو ــ یہ تنظیم طلبہ کے کردار کو اسلامی خطوط پر تعمیر کرنے کا کام کر رہی ہے۔

یونیورسٹی میں اس کی چوتھی پوزیشن ہے۔ یہ کُل پاکستان بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔

ڈھاکہ میں طلبہ کی ایک اور مضبوط تنظیم موجود ہے۔ دینی مدارس میں چھ لاکھ سے زائد طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان جمعیتہ الطلبہ عربیہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ یہ تنظیم اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔

✤ ✤ ✤

طلبہ جس سیاسی مہم میں حصّہ نہ لیں، وہ عموماً کامیاب نہیں ہوتی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی چھ نکاتی مہم کی ناکامی میں طلبہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ عوامی لیگی حلقوں سے معلوم ہوا کہ وہ جولائی کے آخر یا اگست کے وسط میں راست اقدام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ قرائن کہتے ہیں کہ ان کا یہ اقدام ناکام رہے گا، کیونکہ طلبہ امتحانات میں مشغول ہیں اور وہ ہنگامہ آرائی کے موڈ میں نظر نہیں آتے۔

مزدوروں کی تنظیمیں بھی سیاسی قوت کا بہت بڑا منبع ہیں۔ صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی تنظیمیں مؤثر بنتی چلی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں ان تنظیموں نے اہم کردار ادا کیا۔ پھر اسی سال مزدوروں کے اندر ایک خونریز تصادم نے فضل الحق کی وزارت ختم کر ڈالی۔ مزدور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کی تنظیموں کے صدر اور سیکرٹری اپنے آپ کو بہت بڑی قوت سمجھتے ہیں۔ ہڑتالوں، زیرِ زمین سرگرمیوں اور تخریبی کارروائیوں کے لیے یہ تنظیمیں استعمال ہوتی ہیں۔ زیادہ تر عوامی لیگ اور نیشنل عوامی لیگ کا اثر و نفوذ ہے۔ یہ مزدور جس تحریک میں کود پڑتے ہیں، وہ عموماً غیر قانونی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ان عناصرِ خمسہ کے تجزیے کے بعد آپ ایک نظر صوبائی اسمبلی پر بھی ڈال لیں۔ اس سے پورے مشرقی پاکستان کی سیاست کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔

اسمبلی ۱۵۵ اراکین پر مشتمل ہے۔ پانچ خواتین ہیں جن میں ایک باپردہ ہیں۔ ہندو اراکین کی تعداد صرف دو ہے۔ ایوان کے سپیکر جناب عبدالحمید چودھری ستر پچھتر کے پیٹے میں ہیں، لیکن اب بھی دن رات کام کرتے ہیں۔ سلجھے ہوئے پارلیمنٹیرین ہیں۔ ایک مدت سے اسمبلی کے سپیکر چلے آ رہے ہیں۔ مجھے ان کے یہ

الفاظ کبھی نہ بھولیں گے :

"میں اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق کام کرتا ہوں اور کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی"

قائدِ ایوان باسط صاحب صحت مند اور صاف ستھرے نظریات کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کی اصل قوت اسلام ہے۔ جب میں نے پوچھا: آپ کی پارٹی اسلام کو ایک تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی قوت بنانے کے لیے کیا کچھ کر رہی ہے، تو وہ ٹھٹھک کر خاموش ہو گئے۔ ان کی پارٹی نے ایوان میں اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے خلاف ووٹ دیے۔

حزبِ اختلاف کے قائد مسٹر مالک ہیں۔ یہ عوامی لیگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزاد ارکین کی قیادت اسد الزماں کر رہے ہیں۔ بہت تیکھی تقریر کرتے ہیں۔

اسمبلی کی کارروائی باوقار اور رجاندار رہی۔ مضبوط حزبِ اختلاف کی وجہ سے ایوان سرد ہونے نہیں پاتا۔ حزبِ اقتدار کا رویہ بھی بڑی حد تک معقول پایا۔ اسمبلی کے ارکین کی سیاسی تقسیم یہ ہے :

پاکستان مسلم لیگ	۱۱۷	آزاد ارکان	۱۵
عوامی لیگ	۹	نیپ	۴
کونسل مسلم لیگ	۳	ای۔ ڈی۔ ایف	۲
جماعت اسلامی	۱	نظام اسلام	۱

صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے وقت پاکستان مسلم لیگ نے ۱۵۵ نشستوں کے لیے ٹکٹ دیے تھے۔ ان میں سے صرف ۷۰ نشستیں مسلم لیگ کو ملیں۔ آزاد ارکان ۶۰ کے قریب منتخب ہوئے۔ بعد میں مسلم لیگ نے ۴۰ آزاد ممبروں کو جذب کر لیا۔

اسمبلی کے ۱۳۸ ارکان گریجویٹ ہیں۔ ان میں سے ۲۵ قانون دان ہیں، اکثریت کی عمریں ۳۰ اور ۴۵ کے درمیان ہیں۔

۶ نکات
کی
کہانی
شیخ صاحب کی زبانی

اب ہم شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی طرف آتے ہیں۔ چھ نکات کے پس منظر اور اس کے محرکات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چھ نکات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔ یہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ مغربی پاکستان میں چھ نکات کا واضح خاکہ بہت کم لوگوں کے سامنے ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہی کیفیت ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ چھ نکات کا متن مجیب الرحمٰن کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ الفاظ ان کی طرف سے شائع شدہ پمفلٹ "چھ نکاتی فارمولا —— ہمارا زندہ رہنے کا حق" سے لیے گئے ہیں۔ ہم شیخ صاحب کا نقطۂ نظر پوری دیانت داری سے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

نمبر ۱ : دستور، قرارداد لاہور کی بنیاد پر، صحیح معنوں میں، پاکستان کا وفاق قائم کرے جس میں پارلیمانی نظامِ حکومت اور مقننہ کو بالادستی حاصل ہو۔ یہ مقننہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب کی جائے۔

نمبر ۲ : وفاقی حکومت کو صرف دو معاملات میں اختیارات حاصل ہوں: دفاع اور امورِ خارجہ۔ باقی تمام امور وفاق کی تشکیل کرنے والی ریاستوں کی تحویل میں ہوں۔

نمبر ۳ : کرنسی کے بارے میں اِن دونوں میں سے کوئی ایک اقدام کیا جائے:

(۱) دونوں بازوؤں کے لیے دو جداگانہ اور آزادی سے قابلِ مبادلہ نظام ہائے زر رائج کیے جائیں۔

(ب) پُورے ملک کے لیے کرنسی کا ایک ہی نظام ہو، لیکن دستور میں ایسی مؤثر دفعات ہونی چاہئیں جو سرمائے کو مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان جانے سے روک سکیں۔ مشرقی پاکستان کے بنکوں میں زرِ محفوظ ہو اور مشرقی پاکستان کے لیے علٰحدہ مالی اور مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے۔

نمبر ۴: ٹیکس لگانے اور محاصل جمع کرنے کے اختیارات وفاق کی تشکیل کرنے والی ریاستوں کو حاصل ہوں اور وفاقی مرکز کو ایسا کوئی اختیار نہ ہو۔ ریاستیں جو ٹیکس وصول کریں گی، ان میں سے وفاق کے اخراجات چلانے کے لیے مرکز کو ایک خاص فی صد ادا کی جائے گی۔

نمبر ۵: (۱) دونوں بازو جس قدر زرِ مبادلہ کمائیں، اس کے علٰحدہ علٰحدہ حسابات ہونے چاہییں۔

(۲) مشرقی پاکستان جو زرِ مبادلہ کمائے گا، اس پر مشرقی پاکستان کی حکومت کا کنٹرول ہوگا۔ یہی اختیار مغربی پاکستان کی حکومت کو اپنے زرِ مبادلہ پر ہوگا۔

(۳) وفاقی حکومت کے زرِ مُبادلہ کی ضروریات دونوں ریاستوں کی طرف سے مساوی طور پر یا طے شُدہ نسبت سے پُوری کی جائیں۔

(۴) مُلکی مصنوعات، ایک بازو سے دُوسرے بازو تک کسی ڈیوٹی کے بغیر آزادانہ منتقل کی جا سکیں گی۔

(۵) دستور اکائی حکومتوں کو یہ اختیار دے گا کہ وہ ممالکِ خارجہ سے لین دین کے تعلّقات، تجارتی سفارتیں قائم کر سکیں۔ وہ ان کے ساتھ معاہدات میں شریک ہونے کی مجاز بھی ہوں گی۔

نمبر ۶: مشرقی پاکستان کے لیے علٰحدہ ملا ئشیا فوج قائم کی جائے۔

چھ نکات کے پیچھے جو جذبہ اور روح کارفرما ہے اُسے پُوری طرح سمجھنے کے لیے اس کتابچے کا بغور مطالعہ ازبس ضروری ہے جو شیخ مجیب الرّحمٰن نے "چھ نکاتی فارمولا ـــــ ہمارا زندہ رہنے کا حق" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتابچہ بیس صفحات پر مشتمل ہے اور اپنے ایجاز، اپنی قوّتِ استدلال اور اپنے دلکش اسلوبِ بیان کے اعتبار سے وہی مقام رکھتا ہے جو کارل مارکس کے اشتراکی منشور ۱۸۴۸ء کو حاصل ہے۔ خبر نہیں اس کتابچے کو زبان کہاں سے ملی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فِقرے دل میں نشتر کی طرح اُترتے چلے

جاتے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب اس چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ وہ رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر سینوں میں حشر اٹھانے لگتے ہیں۔ عقل اور جذبات کی آمیزش کا یہ عالم ہے کہ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دماغ سے اپیل کی جا رہی ہے، لیکن غیر شعوری طور پر جذبات غالب آ جاتے ہیں اور قاری زبان کی روانی کے ساتھ بے چون و چرا بہتا چلا جاتا ہے۔ میری اپنی یہ کیفیت تھی کہ جب میں نے اس کتابچے کو پہلے پہل پڑھا، تو دیر تک اپنے آپ کو سحر زدہ محسوس کرتا رہا۔

کتابچے کے مصنف نے آغاز میں اڑھائی صفحوں کا ابتدائیہ لکھا ہے اور ایک چالاک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے ان تمام قوتوں پر شروع ہی میں کاری ضرب لگا دی ہے جو چھ نکات کے خلاف مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ذرا فنِ خطابت کو تحریر میں ڈھلتا دیکھیے:

"ہمارے عوام جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی طرف سے جب کبھی معمولی سا معقول مطالبہ کیا گیا، تو مفاد پرست لوگ اور ان کے ایجنٹ چلا اُٹھے: 'اسلام خطرے میں ہے'، 'پاکستان ختم ہو جائے گا'، 'بنگال آزاد ہونے لگا ہے' ——— میں ان مفاد پرستوں کو خوب پہچانتا ہوں۔ یہ بھیس بدل بدل کر عوام کے سامنے آتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ حکمران ٹولی سے وابستہ ہے جو اتحاد، یقین اور تنظیم کا نام لیتا ہے۔ انہی کا ایک گروہ حزبِ اختلاف میں ہے جو اسلام اور جمہوریت کے نعرے بلند کرتا ہے۔ ان سب لوگوں نے چھ نکات کے خلاف ہتھیار سنبھال لیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صدر ایوب، چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی نے، جو بظاہر ایک دوسرے کے دشمن نظر آتے ہیں، مِل بھگت کر کے تین اطراف سے چھ نکات پر زہریلے تیر چلانے شروع کر دیے ہیں۔"

اپنے حق میں نفسیاتی اور ذہنی فضا تیار کرنے کی بھرپور کوشش کے بعد شیخ صاحب نے ہر نکتے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ دلائل کا تانا بانا بظاہر بہت دلکش ہے اور جذبات پر براہِ راست چوٹ پڑتی ہے۔ پہلے نکتے کی وضاحت میں ذرا طرزِ استدلال ملاحظہ کیجیے:

"ہمیں ہمیشہ کے لیے اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ کون ہیں جو اس قراردادِ لاہور کو اپناتے

ہیں اور کون اس سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں جس نے پاکستان تخلیق کیا اور اسی لیے اسے قرار دادِ پاکستان کہتے ہیں۔ جو لوگ قرار دادِ لاہور کے مخالف ہیں، وہ درحقیقت پاکستان ہی کے مخالف ہیں۔ قرارِ داد لاہور سے لاتعلقی کا اظہار وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے پاکستان کی جدّ و جہد میں اُنگلی تک نہیں ہلائی، لیکن عوام کے خُون اور آنسوؤں سے پاکستان بن جانے کے بعد اس پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان کے رہنے والوں نے ایک ایسے دستور کے حق میں ووٹ دیے تھے جو قرار دادِ لاہور کی بنیاد پر مرتّب کیا جائے ـــــ قرار دادِ لاہور پاکستان کے عوام کا میگنا کارٹا ہے اور ہمارے حاکم اور لیڈر اس بات کے پابند ہیں کہ عوام کو ایک ایسا دستور دیں جس کی اساس قرار دادِ لاہور ہو۔"

دُوسرے نکتے کی وضاحت کا انداز یہ ہے:

"یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ وفاق کی مضبوطی کا انحصار اس بات پر نہیں کہ اس پر ڈھیر سارے امور کا بوجھ لاد دیا جائے۔ وفاق، محبّت اور وفاداری کے ان جذبات کی بدولت مضبوط ہوتا ہے جو عوام اس کے لیے اپنے سینوں میں رکھتے ہیں ـــــ اسی اصول پر ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن نے ہندوستان کے لیے ایک ایسا وفاق تجویز کیا تھا جس میں مرکز کو صرف تین امور دیے گئے تھے: دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات ــ کانگرس اور مسلم لیگ نے اس سکیم کو منظور کر لیا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم لیگ مرکز کو صرف تین امور دینے پر رضامند ہو گئی تھی۔ مَیں نے بھی مرکز کو تین ہی امور دیے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مَیں نے مواصلات کی جگہ کرنسی تجویز کی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ پاکستان دو ایسی جغرافیائی وحدتوں پر مشتمل ہے جن کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اور درمیان میں ایک غیر ملک واقع ہے۔ ایسی صورت میں دونوں بازوؤں کے لیے ایک نظامِ مواصلات مفید نہیں ہو سکتا۔ ریلوے کو صُوبوں کی تحویل میں دے دینے سے موجودہ گورنمنٹ نے جغرافیائی حقائق کو بالآخر تسلیم کر لیا ہے۔ ڈاک، تار اور ٹیلی فون کے بارے میں بھی یہی روّیہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

تیسرے نکتے کی وضاحت اڑھائی صفحات پر مشتمل ہے، اس کے چند اقتباسات درج کیے

جاتے ہیں :

"اس وقت ہماری ایک ناقابلِ تقسیم معیشت ہے۔ سکوں پر کوئی ایسا امتیازی نشان نہیں جس سے ہر بازو کی گردشِ زر کا اندازہ ہو سکے۔ ہم صرف ایک وزارتِ مالیات کے قبضے میں ہیں جو مغربی پاکستان میں واقع ہے اور جس کا وزیر بالعموم مغربی پاکستان سے ہوتا ہے۔ یہ وزارت سکّے اور مالیات کی تمام پالیسیاں صرف ایک مرکزی بنک —— سٹیٹ بنیک پاکستان کے ذریعے عمل میں لاتی ہے۔ یہ بنیک بھی مغربی پاکستان میں واقع ہے، اس لیے زر کا اجرا اور سکّہ بازی کا کام مغربی پاکستان ہی میں ہوتا ہے۔ زر تمام ملک میں سفر کرنے کے بعد دوبارہ مغربی پاکستان میں واقع بنیک میں جمع ہونے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ مرکزی بنیک کا صدر دفتر مغربی پاکستان میں ہونے کے ساتھ ساتھ، تمام مشترکہ سرمایے کے بنیکوں کے صدر دفاتر مغربی پاکستان میں ہیں۔ (ایک دو چھوٹے موٹے بنیکوں کے سوا) چونکہ حکومت کا صدر مقام مغربی پاکستان میں ہے اس لیے تینوں افواج، تمام سفارت خانے تقریباً تمام اندرونی اور بیرونی تجارتی تنظیموں کے صدر دفاتر اسی بازو میں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں جو لین دین ہوتا ہے، اس کا روپیہ مغربی پاکستان پہنچ جاتا ہے۔ مشترک سرمایہ کمپنیوں کے تمام حصّے، بنک کی تمام جمع شدہ رقوم اور ان کا زرِ ضمانت، حکومت کا تمام زرِ محفوظ، تجارت اور صنعت کا تمام منافع اور بچتیں چند سیکنڈ میں مغربی پاکستان پہنچ جاتی ہیں۔ بنیکنگ کے ماہرین جانتے ہیں کہ ادائیگی کے لیے جمع شدہ رقوم کا صرف دس فی صد بنیکوں میں کافی ہے، باقی رقوم کاروبار میں لگا دی جاتی ہیں۔ بچتیں، جب کاروبار میں لگائی جاتی ہیں، تو وہ سرمایہ بن جاتی ہیں اور قدرتی طور پر ساری سرمایہ کاری مغربی پاکستان میں مغربی پاکستان کے سرمائے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان میں سرمائے کی تشکیل (CAPITAL FORMATION) کا عمل بہت تیز رہا ہے، چونکہ تشکیلِ سرمایہ کے نتیجے میں صنعت کاری کا عمل بہت تیز ہو جاتا ہے، اسی لیے مغربی پاکستان میں صنعتیں بڑے پیمانے پر قائم ہو رہی ہیں۔ اس وقت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا جب تک سرمائے کی یکطرفہ ٹریفک کو مؤثر انداز میں روکا نہ جائے اور یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مشرقی پاکستان کے لیے

علیحدہ ریزرو بینک قائم کرکے انتقالِ زر کو روک دیا جائے۔ بس یہی ایک راستہ ہے مشرقی پاکستان کو معاشی موت سے بچا لینے کا۔ ہر ریاست کے لئے ریزرو بینک کا نظام، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ان انتظامات کے تحت سٹیٹ بنک میں دونوں بازوؤں کے لئے دو ریزرو بینک ہوں گے مشرقی پاکستان کے لئے کرنسی مشرقی پاکستان کا ریزرو بینک جاری کرے گا اور اس پر 'مشرقی پاکستان' یا صرف 'ڈھاکہ' لکھا ہُوا ہوگا۔ اس طرح مغربی پاکستان کا ریزرو بینک مغربی پاکستان کے لئے کرنسی جاری کرے گا۔ اور اس پر 'مغربی پاکستان' یا صرف 'لاہور' لکھا ہُوا ہوگا۔

اگر مغربی پاکستان کے بھائی اس تجویز پر متفق نہ ہوں، تو پھر کرنسی کو وفاق کی تشکیل کرنے والی ریاستوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ایسا کرنے سے مرکز کمزور نہیں پڑے گا اور نہ اس سے پاکستان کی وحدت پر آنچ آئے گی۔ کیبنٹ مشن نے کرنسی کے بغیر وفاقی مرکز قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔"

یہ طویل اقتباسات میں نے اس لئے دیئے ہیں کہ آپ شیخ صاحب کے نقطۂ نظر کی وسعتوں کو پا سکیں۔ چوتھا نکتہ بہت اہم ہے اور یہی سب سے زیادہ مباحث کا مرکز رہا ہے۔ شیخ صاحب کا استدلال آپ کی ذہانت کی آزمائش ہے، وہ فرماتے ہیں:

میرے اس مطالبے نے "وحدانیوں" اور "نیم وفاقیوں" کو سب سے زیادہ برہم کیا ہے۔ مفاد پرست ہمیشہ سے اصلاحات کے خلاف کیچڑ اچھالتے رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وفاق ٹیکس کے بغیر اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ٹیکس لگانا ایک حق اور ایک اختیار کے بجائے ایک تکلیف دہ ذمّے داری ہے۔ ماضی میں مرکز اپنے آپ کو اس دردسری سے بلند رکھتا تھا۔ یہ تو آجکل کی بنیا ذہنیت نے پیسے بٹورنے کے رجحان کو فروغ دیا ہے۔ روس میں تو یونین (مرکز) مالیاتی ٹیکس بھی نہیں لگاتی۔ وہاں مرکز میں کوئی وزیرِ مالیات بھی نہیں ہے۔

"کیبنٹ مشن نے جو وفاق تجویز کیا تھا، اس میں مرکز کو ٹیکس لگانے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ میری سفارشات کے مطابق دستور میں یہ گنجائش رکھی جائے گی کہ ریاستیں تمام مدّوں میں جو محاصل جمع کریں گی،

ریزرو بینک ان کا ایک خاص فی صد، از خود وفاقی فنڈ کو منتقل کر دے گا۔ دستور میں اس شق کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کے ہنگامی حالات میں مرکز کو زیادہ رقم لینے کا اختیار ہو گا۔

مرکز کو ٹیکس کے جھمیلوں سے محفوظ رکھنے کے مندرجہ ذیل فائدے ہوں گے۔

(ا) وفاق، دفاع اور امورِ خارجہ پر زیادہ توجہ دے سکے گا۔

(ب) ٹیکس کے دوہرے نظام اور اس سے پیدا ہونے والی مقدمے بازی پر جو رقم برباد ہوتی ہے، وہ بچ جائے گی اور اسے اچھے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے گا۔

(ج) ٹیکس اور محاصل کی وصولی ارزاں ہو جائے گی۔

(د) ٹیکس کے جدید ترین طریقے اکہرا محصول بندی (SINGLE TAXATION) کے لئے راستہ ہموار ہو جائے گا۔"

پانچویں نکتے کی وضاحت شیخ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں کی ہے:

تشکیل پاکستان کے بعد اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں:

(ا) مشرقی پاکستان، پاکستان کے سالانہ زرِمبادلہ کا بڑا حصہ کماتا رہا ہے۔

(ب) مشرقی پاکستان کی یہ کمائی مغربی پاکستان میں صنعتیں قائم کرنے پر خرچ ہوتی رہی ہے اور ان صنعتوں سے جو بچت ہوئی، اسے مغربی پاکستان کی بچت قرار دے کر دوبارہ صنعتوں میں لگا دیا گیا۔

(ج) مشرقی پاکستان کی کمائی اس عذر پر مشرقی پاکستان پر خرچ نہیں کی گئی کہ تشکیل سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں سرمایہ کھپانے کی صلاحیت نہیں۔

(د) مشرقی پاکستان کی برآمد، درآمد کے مقابلے میں زیادہ ہے، جبکہ مغربی پاکستان کی درآمد، برآمد کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

(ہ) پاکستان کا دو تہائی زرِمبادلہ پٹ سن سے حاصل ہوتا ہے، لیکن اسے پٹ سن کے کاشتکاروں یا مشرقی پاکستان پر خرچ نہیں کیا جاتا۔

(و) غیر ملکی امداد اور قرضے زیادہ تر اُس زرِمبادلہ کے مقابلے میں حاصل کئے جاتے ہیں جس کا بڑا

حصہ مشرقی پاکستان کماتا ہے۔ لیکن یہ امداد مشرقی پاکستان پر خرچ نہیں کی جاتی۔ بہانہ وہی کہ تشکیل سرمایہ کی کمی ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا :

"مشرقی پاکستان میں صنعت کاری کی رفتار بہت سست ہے۔ جو کچھ تھوڑی بہت صنعتیں قائم ہوئی ہیں، وہ مغربی پاکستان کے رہنے والوں یا اُن اشخاص نے قائم کیں جو مشرقی پاکستان کے نہیں۔ ان لوگوں کے تمام اوصاف وہی ہیں جو غیر ملکی سرمایہ کار کے ہوتے ہیں۔

افراطِ زر کی وجہ سے اشیائے صرف کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔

پٹ سن کے کاشتکاروں کو ضروریاتِ زندگی بھی میسر نہیں "

چھٹے نکتے کی تصریح ملاحظہ فرمائیے :

"مغربی پاکستان کا اسلحہ اور دولت مشرقی پاکستان کے کس کام آسکتی ہے جبکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین ذرائع آمد و رفت چند سیکنڈ میں ختم کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کہ دفاع مرکز کے ہی کے پاس رہے۔ ساتھ ہی ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ مشرقی پاکستان اپنے دفاع میں خود کفیل ہو۔ یہاں ایک آرڈیننس فیکٹری، ملٹری اکادمی اور بحریہ کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا جائے۔ ہم نے ۱۹۵۴ء میں مطالبہ کیا تھا کہ انصار کو اسلحہ اور وردیاں فراہم کی جائیں"

چھ نکات کی وضاحت کے بعد شیخ صاحب نے اہلِ ملک سے ایک دردمندانہ اپیل کی ہے کہ وہ میرا پیغامِ زندگی گھر گھر پہنچا دیں۔ یہ اپیل چھ صفحات پر مشتمل ہے اور تاثیر میں آگ کا اثر رکھتی ہے۔ چند چنگاریاں آپ بھی دیکھ لیں۔

مغربی پاکستان کے شہریوں سے خطاب کرتے ہوئے شیخ صاحب فرماتے ہیں :

"اگر ہمارے پاس ضروریات سے کچھ بھی زیادہ ہو، تو ہم اسے مغربی پاکستان کے بھائیوں پر قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم نے ماضی میں ایسا ہی کیا۔ کیا آپ کو یاد نہیں ؟ خدارا یاد کیجیے۔

۱۔ پہلی دستور ساز اسمبلی میں ہمارے ۴۴ اور آپ کے ۲۸ نمائندے تھے۔ اگر ہم چاہتے، تو جمہوری طریقے

سے تینوں افواج کے ہیڈ کوارٹرز اور دارالسلطنت مشرقی پاکستان لے آتے، مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔

۲ - محبت کے جذبے سے سرشار، ہم نے اپنے ووٹوں سے دستور ساز اسمبلی میں مغربی پاکستان کے چھ نمایندے منتخب کیے۔

۳ - ہم اکثریت کے بل بُوتے پر صرف بنگلہ کو ریاست کی زبان کا درجہ دے سکتے تھے، مگر ہم نے بنگلہ اور اُردو دونوں کے لئے مطالبہ کیا اور کامیاب رہے۔"

آگے چل کر شیخ صاحب ایک آئیڈیل قائد کا تصوّر پیش کرتے ہیں:

"ہمارا ایمان ہے کہ شعورِ مساوات اور دونوں بازوؤں کے مابین انصاف اور غیر جانبداری کا جذبہ پاکستانی حبّ الوطنی کی بنیاد ہے۔ صرف وہی شخص پاکستان کی قیادت کا مستحق ہے جو اس انداز کی محبّ الوطنی سے سرشار ہو، جو خلوص سے یہ محسوس کرتا ہو کہ پاکستان کے یہ دو حصّے ایک جسم کی دوٗ آنکھیں، دوٗ کان، دوٗ ٹانگیں اور دانتوں کی دو قطاریں ہیں، جو یہ احساس رکھتا ہو کہ ان میں سے کسی ایک عضو کو کمزور کرنے سے پورا پاکستان کمزور پڑ جائے گا اور جو اس بات کا عزم کئے ہُوئے ہو کہ وہ پاکستان کے دشمنوں کو سختی سے کچل دے گا۔ پاکستان ایک عظیم الشان ملک ہے۔ اس کا قائد بننے کے لئے بڑا دل اور غیر معمولی وسیع النظری درکار ہے۔"

آخر میں شیخ صاحب کچھ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"بزرگوں کی دعاؤں، ساتھیوں کی رفاقت اور اہلِ وطن کے خلوص آمیز تعاون کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت سے مجھے وہ حوصلہ عطا کیا جو بے پناہ مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں چٹان کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے ہم وطنوں کا پیار میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور میں اُن کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ ایک فرد کی زندگی —— اور وہ بھی میری —— وطن کو نجات دلانے میں کام آجائے تو اور کیا چاہیئے —— میں کام سے نہیں ڈرتا۔ میں نے پورے احساسِ عجز کے ساتھ عظیم الشان ذمّے داری قبول کرلی ہے، کیونکہ مجھے اپنے عوام پر غیر متزلزل اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اندھیری رات کے بعد صبح کا

اُجالا ضرور پھیلتا ہے۔ میرے ہم وطن بارگاہِ ایزدی میں یہ التجا کریں کہ وہ مجھے جسمانی اور ذہنی قوّت وصحت عطا فرمائے تاکہ میں ان کے غصب کئے ہوئے حقوق کی بحالی کے لئے اپنی زندگی وقف کردوں۔"

یہ چھ نکات مُلک کے لئے کس قسم کا سیاسی، معاشی اور آئینی ڈھانچہ تجویز کرتے ہیں، اِس کا صحیح اندازہ آپ کو صرف اُس وقت ہو سکتا ہے۔ جب آپ ان چھ نکات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر غور سے پڑھیں بظاہر یہ چھ نکتے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سب کے پیچھے ایک مربوط منصوبہ ہے۔ آئیے ذرا شیخ صاحب کے ذہن کے اندر جھانکیں۔

پہلے نکتے میں قراردادِ لاہور کی اساس پر وفاق بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ یہ بات بعد میں زیرِ بحث آئے گی کہ شیخ صاحب کو ۱۹ برس گزر جانے کے بعد ۲۶ برس پہلے کی قرارداد کیوں یاد آئی۔ فی الحال آپ قراردادِ لاہور کا مطلوبہ حصّہ پڑھ لیجئے:

جغرافیائی طور پر ملحقہ وحدتوں پر مشتمل خِطّے (REGIONS) ہوں۔ ان خطّوں کو ضروری ردّوبدل کے ساتھ اس طرح تشکیل دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان اکثریت میں ہوں، مثال کے طور پر ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقے (ZONES) ان کو آپس میں اس طرح ملایا جائے کہ ایسی آزاد ریاستیں (GROUPED) وجود میں آجائیں جن کے اجزائے ترکیبی (CONSTITUENT UNITS) خود مختار (AUTONOMOUS) اور مقتدرِ اعلیٰ (SOVEREIGN) ہوں۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اس اصول کی بنیاد پر ایسا دستور تیار کریں۔ جس میں متعلقہ خطوں (REGIONS) کو دفاع، خارجہ پالیسی، مواصلات، کسٹم اور دوسرے ضروری امور پر مکمل اختیار ہو۔

That Geographically contiguous units are demarcated into regions which should be so constituted, with such territorial readjustments as may be necessary, that the areas in which the Muslims are numerically in a majority, as in the North-Western and Eastern Zones of India should be grouped to constitute 'Independent States' in which the constituent units shall be autonomous and Sovereign.

This Session further authorizes the Working Committee to frame a Scheme of Constitution in accordance with these basic principles, providing for the assumption finally by the respective regions of all powers such as defence, external affairs, communications, customs and such other matters as may be necessary.

قراردادِ لاہور کے الفاظ سے مشرق و مغرب میں دو آزاد اور خود مختار ریاستوں کا تصور اُبھرتا ہے ان ریاستوں کے اجزا کا کسٹم، دفاع، خارجہ پالیسی اور مواصلات پر پورا کنٹرول ہوگا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کے دستور کا ڈھانچہ دو ریاستوں کے تصور پر قائم کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے انھوں نے وفاق کی تشکیل کرنے والی اکائیوں کا نام "ریاستیں" رکھا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے نکتے میں دو خود مختار ریاستوں کی طرف واضح اشارہ کر دیا گیا ہے۔

دوسرا نکتہ بھی اسی تصور کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مرکز کے پاس صرف دو امور ہوں گے: دفاع اور خارجہ پالیسی۔ اِس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مرکز کو ایک اور سبجکٹ عطا کر دیتے ہیں اور وہ ہے کرنسی۔ اس اعتبار سے شیخ صاحب وفاق کو تین اختیارات سونپتے ہیں: دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی، اب ذرا شیخ صاحب کے ہاتھ کی صفائی دیکھیے کہ وہ قارئین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مرکز کے تینوں اختیارات غائب کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے دفاع کو لیجئے۔ نکتہ نمبر ۶ کی رُو سے مشرقی پاکستان میں انصار پر مشتمل اپنی فوج ہونی چاہیے، یعنی دفاع پر بھی مرکز کا پورا کنٹرول نہ ہوگا۔ خارجہ پالیسی کا مسئلہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ نکتہ نمبر ۵ کی ذیلی دفعہ کی رُو سے ریاستوں کو اپنے طور پر غیر ممالک میں تجارتی نمائندے بھیجنے اور ان کے ساتھ تجارتی معاہدات کرنے کا حق ہوگا۔ یہ ہر ذی شعور آدمی جانتا ہے کہ خارجہ پالیسی اور خارجہ تجارت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کے الگ الگ ہو جانے سے خارجہ پالیسی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی۔ سترہ روزہ جنگ کے دوران میں حکومتِ پاکستان نے ملائشیا کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لئے۔ اگر ایسے نازک موقع پر پاکستان میں شیخ صاحب کی تجویز کردہ دو خود مختار ریاستیں ہوتیں اور وہ ملائشیا کے ساتھ تجارتی تعلقات

منقطع نہ کرتیں، تو آپ سوچیے کہ مرکز کے اقدام کی کیا حیثیت رہ جاتی۔ شیخ صاحب ریاستوں کو خارجہ تجارت کا حق دے کر کمال ہوشیاری سے خارجہ امور پر مرکز کی گرفت عملاً ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اب کرنسی کا جائزہ لیجیے۔ نکتہ نمبر ۳ کی روشنی میں آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مرکز کا کرنسی پر کوئی اختیار نہ ہوگا۔ اس نکتے میں شیخ صاحب نے دونوں ریاستوں کے لئے علیحدہ علیحدہ نظامہائے زر تجویز کیے ہیں۔ شعبدہ باز کی چابکدستی قابلِ صد تحسین و آفرین ہے کہ اس نے جاندار اور فعال مرکز کو دیکھتے ہی دیکھتے لاشے میں تبدیل کر دیا۔

شیخ صاحب نے محسوس کیا ابھی تک مرکز میں زندگی کے آثار باقی ہیں کہ ٹیکسوں سے مرکز کو تازہ تازہ خون مل رہا ہے۔ شیخ صاحب نے اس نظام کو تلپٹ کرنے کی سوچی۔ نکتہ نمبر ۴ مرکز سے ہر قسم کے ٹیکس لگانے اور محاصل جمع کرنے کے تمام اختیارات سلب کر لیتا ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا جب مرکز کے پاس SUBJECTS ہی نہیں، تو اسے پیسوں کی کیا ضرورت؟ اگر کبھی ضرورت پڑ گئی، تو ریاستیں مرکز کے یتیم خانے کو وقتاً فوقتاً چندہ دے دیا کریں گی۔ شیخ صاحب نے اتنی عنایت کی کہ ریاستوں کو ہدایت کر دی کہ وہ مرکز کو باقاعدگی سے چندہ دیا کریں۔

انہوں نے مرکز پر ایک اور عنایت کی۔ ان کی بالغ نظر نے یہ پہلے ہی سے دیکھ لیا کہ لنگڑے لولے مرکز کو کبھی کبھار زرِ مبادلہ کی ضرورت پیش آئے گی، چنانچہ نکتہ نمبر ۵ کے ذریعے انہوں نے ریاستوں سے درخواست کی ہے کہ وہ مرکز کے زرِ مبادلہ کے اخراجات برداشت کریں۔

آپ نے شیخ صاحب کا شاندار وفاق دیکھا؟

یہ وفاق کتنے دن چل سکتا ہے، کیا دنیا میں کہیں ایسا وفاق پایا جاتا ہے، "یہ عظیم الشان" وفاق ملک کو کن "بلندیوں" پر لے جائے گا، اس وفاق کا خالق اپنے ذہن میں کن منصوبوں کو پرورش کر رہا ہے اور یہ سارا ہنگامہ کس لئے ہے؟ ہم اس انداز کے سوالات اٹھانا نہیں چاہتے۔

شیخ صاحب نے اپنے نکات کی وضاحت میں کتنی بے سروپا باتیں کیں، تاریخی حقائق کس بیدردی سے مسخ کر ڈالے، عوام کے جذبات کو گرم کرنے کے لئے کتنی بے بنیاد داستانیں گھڑیں اور حقائق سے

سے دُور رہ کر کتنے سراب تخلیق کیے، ان کا اندازہ کرنا کچھ آسان نہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر عوام نے ان غلط باتوں پر یقین کر لیا، تو کتنا بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔

مسخ شدہ تاریخی حقائق

شیخ صاحب کی نیت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو عوام کے اعتماد کا امین کہتا ہے، تاریخی حقائق کو مسخ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا قرار دادِ لاہور کے متعلق شیخ صاحب نے جس پُرجوش انداز میں لکھا، اس سے صاف مترشح ہے کہ وہ صرف جذبات سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں تک کہہ گئے:

"جو شخص قرار دادِ پاکستان سے گریز کی راہ اختیار کرتا ہے، وہ اصل میں پاکستان سے بے تعلقی کا اظہار کر رہا ہے۔"

ایک طرف شیخ صاحب کے اس جذباتی جملے پر نظر رکھیے اور دوسری طرف تاریخی حقیقت کو دیکھیے، پھر خود ہی اندازہ کر لیجیے جذبات کا حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔

قرار دادِ لاہور جس نفسیاتی اور ذہنی فضا میں منصّۂ شہود پر آئی، اس کا احساس کیے بغیر قرار داد کی اصل نوعیت کا تعیّن گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگرس نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے، اس کے نتیجے میں مسلم اکابرین میں یہ احساس پختہ ہوتا چلا گیا کہ اسلامی ثقافت اور تہذیب و تمدن اور مُسلمانوں کی جان اور آبرو کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن حاصل کیا جائے۔ اقبالؒ کی نظر نے اس صُورتِ حال کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور انہوں نے ۱۹۳۰ء میں علیحدہ وطن کی ضرورت پر ولولہ انگیز خطبہ دیا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ شعور و احساس ایک حقیقت بن چکا تھا۔ قرار دادِ لاہور میں یہی شعور نظر آتا ہے۔ اس میں آئینی خاکہ اوّلین اہمیت کا حامل نہ تھا، بلکہ ایک علیحدہ وطن کی آرزو باقی تمام جذبوں پر غالب تھی۔ قائداعظم نے اس قرار داد کی حمایت میں جو تقریر کی تھی،

اس کا ایک اقتباس صحیح صورتِ حال کو واضح کر دے گا :

"ہندو اور مسلمان جداگانہ فلسفہ ہائے حیات اور جداگانہ نظامہائے معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ آپس میں شادیاں کرتے ہیں نہ مِل جُل کر کھاتے ہیں۔ درحقیقت اُن کا تمدن ایک دوسرے سے متصادم ہے۔ اِن کا تصورِ زندگی جُدا ہے۔ ہندو اور مسلمان جس تاریخ سے جذبہ اور زندگی حاصل کرتے ہیں، وہ بھی ایک نہیں۔ ان کی جنگیں، ان کے رزمیہ واقعات اور ان کی قابلِ فخر شخصیتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو افراد مسلمانوں کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں، وہی ہندوؤں کے بدترین دشمن ہیں۔ اسی طرح ان کی فتح و شکست کی تاریخ ایک دوسرے سے کہیں بھی نہیں ملتی۔

"اگر برطانوی حکومت برصغیر میں رہنے والوں کو فی الواقع امن اور خوشی دینا چاہتی ہے۔ تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ ہندوستان کی بڑی بڑی قوموں کے لئے جُدا وطن تشکیل کر دیئے جائیں۔"

یہ تھی وہ فضا جس میں قراردادِ لاہور منظور ہُوئی۔ اس کا نام قراردادِ پاکستان اس لئے نہیں پڑا کہ اس میں پاکستان کے لئے آئینی خاکہ دیا گیا تھا، بلکہ اس لئے کہ مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد کا باقاعدہ اعلان کیا۔ یہ قراردادِ تشکیلِ پاکستان میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں سے تو سفر کا آغاز ہُوا تھا۔ رہروانِ شوق نے دُور کے مستقبل میں اپنی منزل کی دُھندلی سی جھلک دیکھی تھی۔ اب اسی دُھندلی سی جھلک کو منزل کا قطعی اور آخری نقشہ قرار دینا کسی باشعور اور تاریخی بصیرت رکھنے والے انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔

قراردادِ لاہور ایک نئے عزم۔ ایک نئی تڑپ اور ایک نئی اُمنگ کی آئینہ دار تھی۔ وہ جدوجہد آزادی کے بے شمار مراحل میں سے ایک مرحلہ تھا۔ کانگریس اور برطانوی حکومت مسلم لیگ کو نئے نئے چیلنج دیتی رہی اور مسلم لیگ ہر چیلنج پر ایک نیا ردِ عمل پیش کرتی رہی، قراردادِ لاہور، ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات اور کانگریس کے ظلم و تشدد کے خلاف ایک ردِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کرپس کمیشن آیا، تو اس نے مسلمانوں

کو فکر کی ایک نئی راہ دکھائی۔ جنگ عظیم کے دوران میں گاندھی جی کی سحر کاریاں مسلم لیگ میں کئی ذہنی اُتار چڑھاؤ پیدا کرتی رہیں۔ شملہ کانفرنس نے مسلمانوں کو ایک نیا چیلنج دیا۔ کیبنٹ مشن تاریخ آزادی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مسلم لیگ نے یہ نیا چیلنج ایک نئی حکمت عملی کے ساتھ قبول کیا۔ یہ سب تاریخ جدوجہد کے مختلف مراحل ہیں، ہم ان میں سے کسی ایک مرحلے کو پاکستان کا منبع قرار نہیں دے سکتے۔ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تشکیل پاکستان کا فیصلہ کُن مرحلہ کون سا تھا اور کس موڑ نے پاکستان کے خدوخال معین کیے تو ہمیں اس مرحلے کو تخلیق پاکستان کے قریبی زمانے میں تلاش کرنا چاہیے، کیونکہ یہی وہ عہد تھا جب ہماری تحریک آزادی مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد پورے طور پر نکھر آئی تھی۔ تاریخ میں یہ فیصلہ کن مرحلہ محفوظ ہے۔ ہم آپ کے سامنے اس کی پوری تصویر پیش کرتے ہیں۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں منتخب ہونے والے مسلم لیگی نمایندوں کا تاریخی اجتماع دہلی میں ہوا۔ اس اجتماع میں پانچ سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی۔ یہ ایک تاریخی اجتماع تھا، جسے اس وقت مسلمان دستور ساز اسمبلی کا نام دیا گیا۔ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی تھی۔ اسی دستور ساز اسمبلی میں حسین شہید سہروردی صاحب نے تشکیل پاکستان کے بارے میں ایک نہایت واضح قرارداد پیش کی۔ قرارداد کے چار نکات ہیں۔ اس میں پہلا نکتہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔

شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل اور شمال مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل علاقے (یعنی پاکستان) جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں ایک خود مختار، آزاد مملکت کی صورت میں تشکیل دیا جائے اور کسی تاخیر کے بغیر قیام پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کا عہد کیا جائے۔

Whereas the Muslims are convinced that with a view to save Muslim India from the domination of the Hindus and in order to afford them full scope to develop themselves according to their genius, it is necessary to constitute a sovereign independent State comprising Bengal and Assam in the North East Zone and the Punjab, North West Frontier Province, Sind and Baluchistan in the North-West Zone.

That the zones comprising Bengal and Assam in the

North-East and the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan in the North-West of India, namely Pakistan Zones where the Muslims are in a dominant majority, be constituted into a sovereign independent State and that an unequivocal undertaking be given to implement the establishment of Pakistan without delay.

اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی واضح قرارداد کی موجودگی میں شیخ صاحب قراردادِ لاہور کی طرف رجوع کرکے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ نے قراردادِ لاہور سفر کے آغاز میں منظور کی تھی اور قراردادِ دہلی سفر کے عین اختتام پر۔ یہ فیصلہ قارئین خود کر لیں کہ تاریخی ارتقا کیا تقاضا کرتا ہے۔

لطف کی بات یہ کہ ایک طرف شیخ صاحب قراردادِ لاہور کو پاکستان کے دستور کی اساس بناتے ہیں، اور دوسری طرف ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں، جو قرارداد لاہور کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) قراردادِ لاہور میں وفاق کا تصور اُبھرتا ہی نہیں، بلکہ مشرق اور مغرب میں آزاد ریاستیں تشکیل پاتی ہیں۔ اس کے برعکس شیخ صاحب وفاق کا خاکہ پیش کرکے اس کا خاکہ اڑا رہے ہیں۔

(۲) قراردادِ لاہور میں دفاع، امورِ خارجہ، کسٹم، مواصلات اور دوسرے ضروری امور متعلقہ علاقوں (RESPECTIVE REGIONS) کی تحویل میں دیئے گئے ہیں، جبکہ شیخ صاحب از راہِ عنایت امورِ خارجہ اور دفاع مرکز کو عطا کر رہے ہیں۔

(۳) قراردادِ لاہور میں مشرق اور مغرب میں آزاد ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا ہے اور جب شیخ صاحب سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ بھی مشرق میں ایک آزاد ریاست قائم کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں، تو جھلّا اُٹھتے ہیں اور اسے ایک بہتان قرار دیتے ہیں۔

دیکھی آپ نے شیخ صاحب کی عظمتِ فکر؟

نکتہ نمبر (۲) میں شیخ صاحب نے کیبنٹ مشن کا حوالہ دیا۔ یہاں بھی ان کی دیانت داری کا مشاہدہ کر لیجیے۔ وہ عوام کو یہ تو بتاتے ہیں کہ کیبنٹ مشن نے مرکز کے لئے صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کی سفارش کی تھی اور اس سفارش کو مسلم لیگ اور کانگریس نے قبول کر لیا تھا، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ کیبنٹ

مشن کے وقت ہندوستان کی سیاسی اور نفسیاتی فضا کیا تھی۔ شاید وہ فضا کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ وہ
خود اسی قسم کی فضا تیار کرنا چاہتے ہیں۔ کیبنٹ مشن نے آزادیٔ ہند کا جو منصوبہ پیش کیا تھا، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مرکزی وفاقی حکومت صرف دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے انتظامات اپنے ذمّے لے۔

(۲) ان امور کے سوا باقی تمام اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔

(۳) صوبوں کے تین گروپ تشکیل دیئے جائیں:

(ا) ہندو اکثریت کے صوبے (ب) مسلم اکثریت کے شمال مغربی صوبے

(ج) بنگال اور آسام

یہ تینوں گروپ اپنی علیحدہ حکومتیں قائم کرنے کے مجاز ہوں۔

(۴) دس سال بعد ہر صوبہ اپنی اسمبلی کی خواہش پر اپنے آپ کو مرکز سے آزاد کرا لینے کا اختیار رکھتا ہو۔

یہ منصوبہ اس وقت پیش کیا گیا تھا، جب کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش انتہائی عروج پر تھی۔ کانگریس کی کوشش یہ تھی کہ مرکز کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ وہ اکثریت کے بل بوتے پر پورے ہندوستان پر حکومت کر سکے۔ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دلانا چاہتی تھی تاکہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں خود مختار حکومت قائم ہو سکے۔ اس وقت کی سیاسی فضا میں مسلمانوں کے لئے کمزور مرکز مفید تھا، کیونکہ صرف اسی طرح کانگریس سے اختیارات چھینے جا سکتے تھے، لیکن پاکستان بن جانے کے بعد کیبنٹ مشن کا حوالہ دینے سے کیا حاصل کرنا مقصود ہے۔ اب کانگریس اور مسلم لیگ کی چپقلش موجود نہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ شیخ صاحب کانگریس اور مسلم لیگ کا ڈراما، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے نام پر کھیلنا چاہتے ہیں۔ اس وقت کمزور مرکز رکھا ہی اس لئے گیا تھا کہ صوبوں کو مرکز سے علیحدہ ہونے کے مواقع مل جائیں۔ کیا اب بھی کمزور مرکز پر اسی لئے زور دیا جا رہا ہے؟

دساتیر کی غلط تعبیریں

نکتہ نمبر ۲ میں شیخ صاحب نے سفارش کی ہے کہ مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے کا حق نہیں ہونا

چاہیئے۔ کیونکہ امریکہ اور روس میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کے دساتیر کا جائزہ لیا جائے۔ امریکہ کے دستور کے آرٹیکل نمبر ا سکشن نمبر ۸ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کانگریس کو ٹیکس، محصول اور اکسائز لگانے اور جمع کرنے کے اختیارات ہوں گے تاکہ وہ قرضوں، دفاع اور ملک کی فلاح و بہبود کا انتظام کر سکے۔"

اس دستوری اختیار کے علاوہ، وفاقی حکومت، ریاستوں کے باقی امور بھی آہستہ آہستہ اپنی تحویل میں لیتی جا رہی ہے۔ فلاح و بہبود، حفاظت اور کاروبار کے مختلف میدانوں میں ریاستوں نے جو تجربات کیے ہیں، ان کی روشنی میں وفاقی حکومت قوانین بنا رہی ہے اور مختلف کمیشنوں کے ذریعے ریاستوں کے معاملات میں دخل دے رہی ہے۔

ریاستوں کو ٹیکسوں کے ذریعے کیا کچھ ملتا ہے، اس کا اندازہ "ڈیوڈ کُشن" کی اس تحریر سے کیجئے، وہ اپنی کتاب "امریکہ کا سیاسی نظام" میں لکھتے ہیں:

"ایک ریاست جائداد غیر منقولہ، جائداد منقولہ، لائسنس، فروخت اور ذاتی آمدنی پر ٹیکس لگا سکتی ہے پٹرول اور سگریٹ پر آبکاری ٹیکس وصول کر سکتی ہے۔ جائداد ٹیکس تو لوکل گورنمنٹ کو چلا جاتا ہے۔ انکم ٹیکس بھی ریاست کو بہت کم ملتا ہے۔ کیونکہ مرکزی حکومت بھی بھاری ٹیکس لگاتی ہے۔ جس امیر آدمی کو اپنی آمدنی کا ساٹھ ستر فی صد وفاقی حکومت کو ادا کرنا پڑے، وہ ریاست کی حکومت کو کیا ادا کرے گا۔ ریاست تمباکو اور پٹرول پر ٹیکس بہت ہی کم لگاتی ہے۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اگر ٹیکس زیادہ لگا دیا، تو قریبی ریاست سے آکر کم داموں پر پٹرول بکنے لگے گا۔"

"چونکہ ریاست کی ٹیکسوں کی آمدنی محدود ہوتی ہے، اس لئے ریاست کی ذمّے داریاں بھی کم ہوتی ہیں ریاستیں وفاقی حکومت سے مالی امداد کی آس لگائے رہتی ہیں۔ سکولوں اور سڑکوں کی تعمیر پر وفاقی حکومت کثیر امداد دیتی ہے ــــــ ۱۹۳۲ء کے بعد سے بے روزگاری اور دوسری آفات سے عہدہ برآ ہونے کی ذمّے داری وفاقی معاشرتی تحفظ کے نظام نے لے لی ہے۔"

اب ذرا روس کے دستور پر نظر ڈالیے۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں ریاستوں (ری پبلک) کو ٹیکس لگانے کا اختیار ہے اور یونین (وفاق) کو اس سلسلے میں اختیارات حاصل نہیں، مگر شیخ صاحب کو یہ بات بھی بتانی چاہیے تھی کہ روس کے دستور نے سارے اختیارات صرف ایک سیاسی پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) کو تفویض کیے ہیں۔ رُوس کے بارے میں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہاں صرف دو سیاسی جماعتیں زندہ رہ سکتی ہیں۔ ایک برسر اقتدار اور دوسری جیل میں۔ رُوس میں ریاستوں اور وفاق پر کمیونسٹ پارٹی کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ اس کے فیصلے کے خلاف مرکز یا ریاست کو ایک قدم اٹھانے کی اجازت نہیں۔ وہاں مرکز اور وحدتوں میں اختیارات کی تقسیم بے معنی ہے۔ صرف ایسے جابرانہ نظام میں ریاستوں کو ٹیکس لگانے کے تمام اختیارات دیئے جا سکتے ہیں۔ کیا شیخ صاحب ہمارے وطن میں بھی اسی انداز کا سیاسی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں؟ روس کے دستور میں ریاستوں کو وفاق سے کٹ جانے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ خبر نہیں شیخ صاحب نے اس حق کا مطالبہ کیوں نہ کیا۔

گُمراہ کن اعداد و شمار

نکتہ نمبر ۵ کے تحت شیخ صاحب نے ایسی غیر محتاط باتیں کی جو عوام کے اذہان میں ایک مُدت تک زہر گھولتی رہیں گی۔ وہ کہتے ہیں:

"مشرقی پاکستان ہر سال زرِ مبادلہ کا بہت بڑا حصہ کماتا ہے۔"

ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کی بحث کو طول دینا پسند نہیں کرتے، کیونکہ اس سے تلخی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، لیکن باشعور لوگوں کو صحیح صورتِ حال سے باخبر رکھنا بہت ضروری ہے، ہم ذیل میں برآمد کے اعداد و شمار دے رہے ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان نے کتنا کتنا زرِ مبادلہ کمایا۔

سال	مشرقی پاکستان سے برآمد	مغربی پاکستان سے برآمد
۴۸-۴۹	۴۲ کروڑ ۹۰ لاکھ	۵۸ کروڑ ۸۵ لاکھ
۵۱-۵۲	ایک ارب ۸ کروڑ ۶۶ لاکھ	۹۲ کروڑ ۱۹ لاکھ
۵۵-۵۶	ایک ارب ۴ کروڑ ۱۲ لاکھ	۷۴ کروڑ ۲۴ لاکھ
۶۲-۶۳	ایک ارب ۳۵ کروڑ	۹۹ کروڑ ۸۰ لاکھ
۶۳-۶۴	ایک ارب ۲۲ کروڑ	ایک ارب ۷ کروڑ
۶۴-۶۵	(چھ ماہ کا) ۶۲ کروڑ	۵۲ کروڑ

آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ شیخ صاحب کا یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ پاکستان کا دو تہائی زرِ مبادلہ پٹ سن سے حاصل ہوتا ہے۔ اُوپر دیئے ہُوئے اعداد و شمار سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ مغربی پاکستان کی برآمد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور ایک دو برس میں وہ مشرقی پاکستان کے برابر آجائے گا۔ اب جونکہ حساب کتاب کی بات چل نکلی ہے، تو ایک اور نکتے پر بھی غور فرمایئے۔ مغربی پاکستان کی برآمد اس لئے کم نظر آتی ہے کہ وہ جن اشیاء سے زرِ مبادلہ کما سکتا تھا، ان کا ایک حصہ مشرقی پاکستان بھیج دیا جاتا ہے۔ اگرچہ مشرقی پاکستان سے بھی کئی چیزیں آتی ہیں، مگر مغربی پاکستان جو مال بھیجتا ہے، اس کی رقم زیادہ ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار آپ پر یہ حقیقت واضح کر دیں گے:

سال	مشرقی پاکستان جو مال مغربی پاکستان بھیجتا ہے	مغربی پاکستان جو مال مشرقی پاکستان بھیجتا ہے
۵۳-۵۴	۱۵ کروڑ	۳۸ کروڑ ۲۷ لاکھ
۵۴-۵۵	۲۰ کروڑ	۳۰ کروڑ ۴۹ لاکھ
۵۷-۵۸	۲۴ کروڑ ۲۷ لاکھ	۷۰ کروڑ ۱۷ لاکھ
۶۱-۶۲	۳۶ کروڑ ۶۵ لاکھ	۸۱ کروڑ ۵۱ لاکھ
۶۲-۶۳	۴۰ کروڑ ۱۹ لاکھ	۸۵ کروڑ ۵۱ لاکھ

شیخ صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ مغربی پاکستان کی درآمد مشرقی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ہے ہم درآمد کے اعداد و شمار بھی پیش کر رہے ہیں۔

سال	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان
۴۸-۴۹	۲۸ کروڑ ۸۲ لاکھ	ایک ارب ۱۷ کروڑ ۶۷ لاکھ
۵۶-۵۷	۸۱ کروڑ ۹۵ لاکھ	ایک ارب ۵۱ کروڑ
۵۷-۵۸	۷۳ کروڑ ۵۶ لاکھ	ایک ارب ۳۱ کروڑ
۶۰-۶۱	ایک ارب ایک کروڑ	۲ ارب ۱۷ کروڑ
۶۲-۶۳	ایک ارب ۲ کروڑ	۲ ارب ۸۰ کروڑ
۶۳-۶۴	ایک ارب ۴۵ کروڑ	۲ ارب ۹۸ کروڑ

واقعی مغربی پاکستان کی درآمد، مشرقی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ہے، تاہم مشرقی پاکستان اس میدان میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ بھی تجزیہ کیا کہ مرکزی حکومت جو زرِ مبادلہ کماتی ہے، وہ مشرقی پاکستان پر خرچ نہیں کرتی۔ ہم صرف دوسرے پنج سالہ منصوبے کے اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ مرکز نے کتنا زرِ مبادلہ پبلک سیکٹر میں صوبوں پر خرچ کیا۔

سال	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان	مشترکہ
۶۰-۶۱	۳۲ کروڑ ۲ لاکھ	۳۴ کروڑ ایک لاکھ	۶۱ کروڑ ۱۷ لاکھ
۶۱-۶۲	۳۲ کروڑ ۵۳ لاکھ	۲۹ کروڑ ۵۵ لاکھ	۷۶ کروڑ ۹ لاکھ
۶۲-۶۳	۳۷ کروڑ ۲۸ لاکھ	۲۰ کروڑ ۲۷ لاکھ	۷۳ کروڑ ۲۲ لاکھ
۶۳-۶۴	۳۹ کروڑ ۳۶ لاکھ	۲۹ کروڑ ۳۴ لاکھ	۷۴ کروڑ ۵۶ لاکھ
۶۴-۶۵	۳۹ کروڑ ۲۰ لاکھ	۲۷ کروڑ ۹۱ لاکھ	۸۱ کروڑ ۸۹ لاکھ

شیخ مجیب الرحمٰن صاحب نے اپنے عوام کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھا کہ مشرقی پاکستان میں تشکیلِ سرمایہ کا عمل بہت سست ہے اور اس بازو میں صنعتی ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار اس فریبِ حقیقت کو چاک کر دیتے ہیں۔ سرمائے کی تشکیل آمدنی میں اضافے سے ہوتی ہے۔ آمدنی میں اضافے کی رفتار یہ ہے:

		۱۹۴۹ - ۵۰ء	۵۹ - ۶۰ء	۶۲ - ۶۴ء
قومی آمدنی میں اضافہ	مشرقی پاکستان	۱۱۱۰۰ ملین	۱۳۵۰۰ ملین	۱۶۳۵۰ ملین
	مغربی پاکستان	۱۱۴۰۰ ملین	۱۵۱۰۰ ملین	۱۸۱۵۰ ملین
فردِ واحد کی آمدنی میں اضافہ	مشرقی پاکستان	۲۵۲	۲۵۰	۲۷۳
	مغربی پاکستان	۳۲۶	۳۳۶	۳۶۲

معیشت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے پبلک سیکٹر میں ترقیاتی سکیموں پر زیادہ کثیر رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں مشرقی پاکستان پبلک سیکٹر میں ۳۰۱۰۰ ملین خرچ کرے گا۔ جبکہ مغربی پاکستان کے حصے میں صرف ۱۴۸۰۰ ملین آئیں گے۔

پرائیویٹ سیکٹر کی صورتِ حال اور بھی خوش آئند ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے حصے میں برابر ۱۱۰۰ کروڑ روپے آئیں گے۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں مشرقی پاکستان پر صرف ۳۴۰ کروڑ روپے خرچ آنے تھے۔ اس اعتبار سے اضافہ تقریباً ۲۲۳ فی صد ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان کا اضافہ صرف ۷۵ فی صد ہے۔ کیونکہ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں اس کا حصہ ۶۲۰ کروڑ تھا۔

یہ اعداد و شمار یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ شیخ صاحب جو زہر آلو باتیں فضا میں تحلیل کرتے رہے ہیں، ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ انہوں نے جن مفروضات کو بنیاد بنا کر اپنا عظیم الشان منصوبہ تیار کیا ہے، وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ قراردادِ لاہور کی آئینی حیثیت آپ پر واضح ہو گئی، آپ کو

یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دنیا میں کوئی ایسا "وفاق" نہیں ہے جسے ٹیکس لگانے کا حق ہو۔ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ مشرقی پاکستان کتنا زرِمبادلہ کماتا ہے اور مرکزی حکومت وہاں کے تعمیری منصوبوں پر کتنا خرچ کرتی ہے۔ آپ نے یہ بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ اس خوفناک کہانی میں بھی کوئی حقیقت نہیں کہ مغربی پاکستان کا اژدھا مشرقی پاکستان کو نگل رہا ہے۔ آپ کے سامنے یہ حقائق بھی آگئے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی معیشت روز بروز مستحکم ہوتی جارہی ہے۔

اب ہم تفصیل سے ان عوامل کا ذکر کریں گے جنہوں نے چھ نکات کے لئے راستہ ہموار کیا، اِن چنگاریوں کو ہوا دی اور مشرقی پاکستان کے عوام نے جب اِن چنگاریوں کو بھڑکتے دیکھا، تو انہوں نے کیا محسوس کیا۔ ہم اِس امر کا بھی جائزہ لیں گے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اِن چھ نکات سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ کتنا کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

۶ نکات

کے

پردۂ زنگاری کے پیچھے کون ہے؟

ہمیں، شیخ مجیب الرحمٰن صاحب کی نیت کا کچھ علم نہیں، تاہم جو منصوبہ انہوں نے پیش کیا، وہ مسائل حل کرنے کے بجائے انہیں اور الجھا دیتا ہے وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ مرکز سے اختیارات چھین لینے کے بعد انہیں صوبے کی بھلائی کے لئے کن خطوط پر استعمال کریں گے۔ مزدوروں کے گمبھیر مصائب، جو روز بروز بھیانک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، ان کا ازالہ کیا ہوگا۔ وہ اس معاملے میں بھی خاموش ہیں کہ عوام غربت کے چنگل سے کیونکر رہائی پائیں گے۔ انہوں نے اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا کہ سیلاب کی تباہ کاریاں کس طرح ختم ہو سکیں گی اور معیشت کا بنیادی ڈھانچہ کیونکر مستحکم بنایا جائے گا۔ ان مسائل کا انہوں نے جذباتی انداز میں ذکر تو کیا ہے، مگر ان کا کوئی واضح اور قابل عمل حل پیش نہ کیا۔

آپ ذرا غور تو کیجئے، کیا مرکز سے اختیارات چھین لینے سے مشرقی پاکستان خوشحال ہو جائے گا۔ آخر یہ اختیارات کن لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہوں گے؟ یہ اختیارات اسی صوبائی منتظمہ اور نظم و نسق کو سونپے جائیں گے جو ماضی میں عمدہ کارکردگی سے محروم رہی جو صوبائی نظم و نسق میں آنے کے بعد پاک ایسٹرن ریلوے کا جو حال بنا، وہ ایک حساس محب وطن کے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔ شیخ صاحب کہتے ہیں سٹیٹ کو صوبے کی جگہ سٹیٹ کا لفظ استعمال ہوا ہے، تمام ٹیکس عائد کرنے اور محاصل وصول کرنے کا حق دیا جائے۔ کاش! یہ مطالبہ کرنے سے پہلے شیخ صاحب اس حقیقت پر نظر ڈال لیتے کہ صوبائی حکومت کروڑوں روپے کی مالیت کے ٹیکس وصول کرنے

ہیں ناکام رہی ہے اور بعض اہم مدوں میں جو ٹیکس وصول کئے گئے، ان کی مالیت اور ٹیکس جمع کرنے کے اخراجات تقریباً تقریباً برابر ہیں، یعنی اگر ایک خاص مد میں ۵ کروڑ کے ٹیکس جمع ہوئے، تو انہیں جمع کرنے کے اخراجات بھی ۵ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ ایسی فعال، مستعد اور تجربے کار مشینری کے ذمے اگر تمام ٹیکس عائد کرنے کے فرائض سونپ دیئے جائیں، تو جو نتائج برآمد ہوں گے، اس کا اندازہ آپ خود کر لیجیے۔

یہ وہی صوبائی نظم و نسق ہے جس نے ماضی میں عوام کے ساتھ ناقابلِ معافی زیادتیاں کی ہیں۔ مرکزی حکومت صوبے کی ترقی کے لئے مالیات منظور کرتی تھی، لیکن یہ اپنے تساہل، غفلت اور نااہلی کی وجہ سے اس رقم کا بڑا حصہ خرچ کرنے سے قاصر رہتا تھا۔ ذیل کے گوشوارے سے آپ اس انتہائی تکلیف دہ حقیقت کی ایک جھلک دیکھ سکیں گے:

۱۹۴۸ - ۴۹ء اور ۱۹۴۹ - ۵۰ء میں مشرقی پاکستان کو ۸ کروڑ اور ۲۱ لاکھ کی رقم ہر سال مخصوص ہوئی لیکن اس رقم میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۵۳ - ۵۴ء، ۱۹۵۴ - ۵۵ء اور ۱۹۵۵ - ۵۶ء میں جو رقمیں مخصوص ہوئیں، ان کا صرف ۵۰ فی صد استعمال ہوا۔ ۱۹۵۶ - ۵۷ء میں ۲۰ کروڑ ۶۹ لاکھ کی رقم مخصوص کی گئی جس میں سے صرف ۸ کروڑ، ۴ لاکھ خرچ ہوئے۔ ۱۹۵۷ - ۵۸ء میں خرچ ہونے والی رقم کی فی صد قدرے بڑھ گئی۔

یہ اعداد و شمار بڑے تشویش ناک ہیں۔ اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت نے ترقیاتی سکیمیں بروقت منظور نہیں کیں اور وہ جان بوجھ کر روڑے اٹکاتی رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبائی حکومت مختص رقمیں خرچ نہ کر سکی۔ مرکزی حکومت کا نقطۂ نظریہ ہے کہ ترقیاتی سکیمیں محنت اور توجہ سے تیار نہیں کی جاتی تھیں اور انہیں چھان بین اور جانچ پڑتال کے مختلف مراحل سے گزرے بغیر منظور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک طویل بحث ہے جس میں الجھنا وقت کا ضیاع ہے، مگر اس میں ایک پہلو قابلِ غور ہے۔ ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک (ایک یا سوا سال کا عرصہ نکال کر) مرکزی حکومت کی عنان ان لوگوں کے ہاتھ میں رہی جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور فیروز خان نون بھی جناب سہروردی کے دستِ نگر تھے۔ ان حالات میں مرکزی حکومت کا رویہ

مشرقی پاکستان سے معاندانہ کیسے ہو سکتا تھا۔

شیخ صاحب نے سرمائے کو مغربی پاکستان میں جانے سے روکنے کے لئے دو نظامہائے زر کا منصوبہ پیش کیا بھلا ان مصنوعی تدبیروں سے کبھی مسائل حل ہوتے ہیں۔ یہ تو معاشیات کا بنیادی اصول ہے کہ سرمائے کو جہاں کشش نظر آئے گی، از خود اس طرف جائے گا۔ یہ درست کہ یہ مشرقی پاکستان کا بہت بڑا مسئلہ ہے، مگر اسے حل کرنے کے لیے فطری اور ارتقائی راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم آگے چل کر اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کریں گے۔ یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ دو نظامہائے زر سے دونوں بازوؤں میں نفسیاتی بُعد اور دُوری تو پیدا ہو سکتی ہے، لیکن معاشی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ذرا اس صورت حال کا تصور تو کیجیے کہ آپ لاہور سے ڈھاکہ جانا چاہتے ہیں۔ اب آپ کو مشرقی پاکستان کی کرنسی حاصل کرنے کی فکر ہے۔ آپ پر وہی نفسیاتی کیفیت طاری ہوگی جو بیرون ملک جاتے وقت طاری ہوتی ہے۔ خدا را بتایئے یہ ملک کی کون سی خدمت ہے؟

دو معیشت کا نظریہ بظاہر بہت مدلل نظر آتا ہے اور ہو سکتا ہے معاشیات کے ماہرین اسے غلط قرار نہ دیں مگر یہ بھی تو ایک سطحی حل ہے۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جغرافیائی دُوری کو کم کرنے کی راہیں نکالنے کے بجائے ایک ایسا منصوبہ پیش کیا گیا ہے جو دونوں بازوؤں کو آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بے تعلق کر دے گا۔ ان دونوں علاقوں کے درمیان دو ہی باتیں تو مشترک ہیں: اسلام اور معاشی انحصار کا احساس۔ اسلام کو آپ پہلے ہی سیاسی زندگی سے جلاوطن کر چکے، اب اگر معاشی احتیاج کا احساس بھی ختم ہو گیا، تو پھر کون سی قوت دونوں بازوؤں کو متحد رکھ سکے گی۔ معاشی اختلاط یک جہتی اور ذہنی قربت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ یہ فضا قائم رہنی چاہیے، لیکن دو معیشت کا نعرہ اس فضا کو چٹ کر جائے گا۔

دونوں ریاستیں اپنا اپنا زرِ مبادلہ لے کر جب بین الاقوامی مارکیٹ میں نکلیں گی، تو انہیں خسارے کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ بڑے بڑے ملکوں پر معیشت کے بین الاقوامی دباؤ کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے آپ کو تن تنہا اس کے مقابلے میں ٹھہرنے کے قابل نہیں سمجھتے، چنانچہ یورپین کامن مارکیٹ (ای، سی، ایم) علاقائی اتحاد برائے ترقی (آر، سی، ڈی)، اور اسی قسم کی متعدد تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ جب پاکستان اٹھارہ انیس

برس کی جدوجہد کے بعد دنیا سے باوقار معاہدے کرنے کے قابل ہوا، تو ہم اپنے زرِ مبادلہ کی تقسیم پر جھگڑنے لگے۔ بین الاقوامی معیشت کی ایک ہی تند و تیز لہر دونوں ٹکڑوں کو بہا کر لے جائے گی۔ سمجھاؤ تو سہی پاکستان کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟ شیخ صاحب صرف یہ چاہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کا کمایا ہوا زرِ مبادلہ مشرقی پاکستان ہی پر خرچ ہو۔ یہ مطالبہ جائز ہے، مگر اس کے لئے انہوں نے جو راستہ اختیار کیا، وہ خطرات سے پٹا پڑا ہے ـــ انتہائی ہولناک خطرات سے۔ ایک ہوش مند آدمی یہ راستہ کبھی اختیار نہیں کرے گا۔

عوام کے ذہن اور مزاج پر چھ نکات کے ہنگاموں نے انتہائی بُرے اثرات مرتب کیے۔ اس منصوبے میں مسائل کی صحیح نشان دہی اور ان کا تعمیری حل پیش کرنے کے بجائے مسائل کی ایک جذباتی فضا تیار کی گئی۔ اس بات کا شدید خدشہ ہے کہ چھ نکات کے زبردست پراپیگنڈے کی بدولت عوام کہیں یہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے مسائل مرکز سے اختیارات چھنتے ہی حل ہو جائیں گے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ محنت اور ریاضت کا شوق ابھرنے کے بجائے احتجاج اور ہنگامہ آرائی کا مزاج تیار ہو رہا ہے ـــ اور یہ بالکل فطری نتیجہ ہے اس خرابی کا جو چھ نکات کے ذریعے ذہن میں پیدا ہو رہی ہے۔ طلبہ کو دیکھ لیجیے، ان کا زیادہ وقت مغربی پاکستان کے خلاف اعداد و شمار جمع کرنے اور انہیں ازبر کرنے میں صرف ہو جاتا ہے، دفتر کے لوگوں سے باتیں کیجیے، وہ ہر پھر کر مغربی پاکستان کی زیادتیوں کا ذکر کریں گے۔ غضب یہ ہے کہ مزدور اور اہلِ حرفت اپنے فن میں کمال پیدا کرنے کے لئے ذرا بھی تگ و دو نہیں کریں گے، لیکن مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اعداد و شمار میں طاق ہوں گے۔ چھ نکات نے اس ذہن کی آبیاری کی ہے (اور کر رہے ہیں) جو محنت اور مشقت کے بغیر زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہمارے نوجوانوں میں زندگی کے حقائق کے متعلق غیر سنجیدہ رویّہ پرورش پاتا رہا، تو پھر ہمیں اچھے دنوں کی امید نہیں لگانی چاہیے۔ ہم جذبات کو مشتعل کر کے کتنا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں! خدا نہ کرے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں جذبات کی نذر کرتے چلے جائیں اور تعمیری کام کرنے والے ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں۔ کسی قوم کا اصل سرمایہ اس کے فرض شناس، جواں ہمت اور مستعد افراد ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ

پونجی ختم تو نہیں ہو رہی؟

چھ نکات کا مشرقی پاکستان کی زندگی پر سب سے زیادہ خطرناک اثر یہ پڑا ہے کہ ایک چھوٹا سا طبقہ کھلم کھلا علحدگی کی باتیں کرتا ہے۔ علحدگی کے رجحانات کو تقویت دینے ہیں اور بھی عوامل کام کر رہے ہیں (جن میں سے ایک بڑے عامل کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے)، لیکن چھ نکات نے اس ذہن کو مہمیز لگا دی ہے مجھے مختلف شعبوں میں یہ طبقہ نہایت ہی قلیل تعداد میں نظر آیا ہے، مگر یہ طبقہ ہے بہت موثر اور فعال۔ میرے ان گنہگار کانوں نے علحدگی کے پلان کی تفصیلات سُنیں اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اُمڈ پڑے۔ میں اس طبقے کی علانیہ نشان دہی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس سے فساد پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ چھ نکات کے علمبردار اس طبقے کی پشت پناہی کر رہے ہیں، (میرے پاس ایسا کہنے کے لئے ٹھوس ثبوت نہیں)، لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ چھ نکات کی تحریک سے اس طبقے کو فعال بننے میں بہت مدد ملی ہے۔ بھارت نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور آج بھی ہر روز آل انڈیا ریڈیو رات کے نو بجے مشرقی پاکستان کے متعلق زہر اُگلتا ہے۔ وہاں کے اخبارات اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ بھارت میں ایک ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں مشرقی پاکستان کی علحدگی کا منصوبہ درج ہے۔ کیا ایک محبِ وطن اس صورتِ حال کو خوشگوار کہہ سکتا ہے؟

صرف یہی نہیں، بین الاقوامی پریس میں چھ نکاتی پروگرام کو غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ بعض ملکوں کے اخبارات نے یہ تاثر دیا کہ اس طوفان کے آگے پاکستان ٹھہر نہیں سکے گا۔ اس سلسلے کی کچھ تفصیلات شاید آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں۔

لندن ٹائمز نے چھ نکات پر جو سرخی جمائی تھی، وہ ذرا ملاحظہ کیجیے:

"مشرقی پاکستان میں طوفان کا سگنل"

لندن آبزرور نے سائرل ڈون سے شیخ مجیب الرحمن کے انٹرویو کی روداد بڑی تفصیل سے شائع کی ہے۔ یہ روداد کئی پہلوؤں سے اہم ہے۔ تفصیل کا اس وقت موقع نہیں۔ اکانومسٹ، نیویارک

ٹائمز، نیویارک ہیرلڈ ٹربیون اور پیرس کے لی مونڈے کے اداریتی نوٹ دیکھیے۔ بھارت کے اخبارات نے خوشیوں کے شادیانے بجائے۔ کلکتہ کے سٹیٹسمین نے لکھا:

"موجودہ حکومت مشرقی پاکستان میں خود مختاری کی ابھرتی ہوئی تحریک کو کبھی نہیں دبا سکے گی۔"

کلکتہ سے شائع ہونے والے ایک اور اخبار دی کمپاس نے اپنے ٹائیٹل کور پر مجیب الرحمٰن کی بہت بڑی تصویر شائع کی اور لکھا:

"مشرقی پاکستان کا محبوب ترین جواں سال قائد"

آخر یہ سب کچھ کس لیے ہوا اور کیونکر ہوا؟ پردودا (ممدوس) نے اپنے اداریے میں سخت زبان استعمال کی ہے اور اس نے چھ نکات کے علمبرداروں پر الزام لگایا ہے کہ وہ سامراجیت کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ بین الاقوامی پریس میں چھ نکات کے متعلق اس انداز کی بحثیں ملک کے وقار اور عظمت میں اضافہ نہیں کرتیں، اہلِ دل کا درد بڑھا دیتی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اب میں اس تحریک کا دوسرا پہلو پیش کرتا ہوں۔ بہت سے ذہنوں میں یہ سوال بار بار اُبھرتا ہے کہ مشرقی پاکستان جیسے خطّے میں جہاں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کو سب سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اسی عظیم الشان کامیابی کے بل بوتے پر قائداعظمؒ نے کانگرس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیے تھے، وہاں صرف اٹھارہ اُنیس برس بعد یہ تشویش ناک صورت کیوں پیدا ہو گئی؟ ستمبر کی جنگ میں مشرقی پاکستان اپنے مغربی پاکستانی بھائیوں کے لئے محبت اور خلوص میں ڈوبا ہوا تھا، صرف پانچ ماہ گزرنے کے بعد وہاں نفرت کی زہر آلود فضا کیونکر قائم ہو گئی؟ لوگوں کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ وہ سیاسی جماعت اور وہ سیاسی قائد جس کا ماضی داغدار ہے، مشرقی پاکستان کو ہنگاموں کی سرزمین بنانے میں کیسے کامیاب ہو گئے (میں نے "داغدار" کا لفظ پوری ذمے داری سے استعمال کیا ہے، آگے چل کر تفصیلات آپ کے سامنے آجائیں گی)، یہ سوالات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور اگر ان کا جواب

تلاش نہ کیا گیا، تو ہم نئے خطرات سے یقیناً دوچار ہوں گے۔

میں نے ان سوالات کے جواب بہت سے واقعات کو دُور تک کھودنے کے بعد تلاش کیے۔ یہ جوابات ہو سکتا ہے، کچھ لوگوں کے مزاج کے خلاف ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جوابات بالکل صحیح نہ ہوں، لیکن دیانت داری کا تقاضا ہے کہ میں نے جو کچھ محسوس کیا، اسے فہمیدہ لوگوں کے سامنے جُوں کا تُوں رکھ دوں۔

چھ نکات کا پس منظر ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں صدارتی انتخاب کی طرف جانا ہو گا۔ انتخاب کی مہم میں پانچ مخالف جماعتیں مل جُل کر کام کر رہی تھیں۔ جُوں جُوں انتخابی مہم تیز ہوتی گئی، شیخ مجیب الرحمٰن صاحب اپنے آپ کو آگے لانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ ان سیاسی جماعتوں نے یہ طے کیا تھا کہ کوئی جماعت اپنا یا اپنے لیڈر کا نعرہ نہیں لگائے گی، لیکن عوامی لیگ نے شیخ صاحب کے نعرے لگانے کا اہتمام کیا۔ شیخ صاحب نے، جو شعلہ نوا مقرر ہیں، آگے بڑھ کر حاضرین سے خطاب کرنا شروع کر دیا اور یہ تاثر دینے لگے کہ اس مہم میں سب سے زیادہ اہم کردار شیخ صاحب اور عوامی لیگ ادا کر رہی ہے۔ اس صورتِ حال سے نیپ بہت گھبرائی اور اس نے بھی مختلف مقامات پر اپنے حق میں نعرے لگوائے، لیکن شیخ صاحب کی متعدی نیپ کے قائدین پر غالب آئی اور مولانا بھاشانی بددِل ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کی موت سے شیخ صاحب کو اُبھرنے کا اور موقع مل گیا۔ اب میدان خالی تھا۔ مولوی فرید احمد جس تنظیم کی قیادت کر رہے تھے، وہ کارکنوں اور حلقۂ اثر کے اعتبار سے عوامی لیگ کے مقابلے میں نہ آتی تھی۔ جماعتِ اسلامی کو انتخابات کا کچھ زیادہ تجربہ نہ تھا۔ اس پس منظر میں شیخ صاحب کے اندر اس احساس کا پیدا ہونا بالکل فطری تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کی قیادت سنبھال سکتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی قیادت چمکانے کی مختلف تدبیریں اختیار کیں۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ نیپ چین سے تعلقات کے سوال پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ مجیب صاحب کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل گیا کہ نیپ تو حکومت کی جماعت ہے۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نیپ

کی مقبولیت کو دھکا لگنے سے شیخ صاحب کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہو گئی۔ جناب نور الامین اور عطا الرحمٰن خان، شیخ صاحب کی شخصیت کے لئے ایک زبردست چیلنج تھے، مگر انہوں نے قومی جمہوری محاذ میں مقید ہو کر اپنی سیاسی سرگرمیاں معطل کر رکھی تھیں۔ اب سیاسی میدان میں شیخ صاحب کے مدِمقابل کوئی بھی نہ تھا۔

ستمبر ۶۵ میں پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑ گئی۔ مشرقی پاکستان میں بے پناہ جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ نوجوان مغربی پاکستان پہنچ جانے کے لئے بے قرار تھے، تاکہ وہ اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہو سکیں، ریڈیو پاکستان ڈھاکہ اور راج شاہی نے بھارت کے خلاف انتہائی موثر مہم شروع کی۔ مجھے بتایا گیا ریڈیو کے منتظمین نے تمام سیاسی قائدین کا تعاون حاصل کیا، لیکن دو لیڈروں نے بھارت کے خلاف ریڈیو پر تقریر کرنے سے انکار کر دیا۔ ان دو میں سے ایک شیخ صاحب تھے۔ (دوسرے صاحب کا نام بتانا اس وقت موزوں نہیں) یہ بات انتہائی عجیب وغریب تھی بھارت کا عفریت پاکستان کو نگل لینا چاہتا تھا اور ہم میں ایسے قائدین بھی تھے جو اس نازک وقت پر خاموش رہنا چاہتے تھے۔ جن جن لوگوں کو اس بات کا علم ہوا، انہیں ذہنی طور پر سخت صدمہ پہنچا لیکن چونکہ عوام اس شرمناک حقیقت سے آگاہ نہ تھے، اس لئے شیخ صاحب کی لیڈری کو ذرا سا بھی نقصان نہ پہنچا۔

مختلف ذرائع سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ شیخ صاحب حکومت کی طرف سے دی گئی دعوتوں میں مدعو کئے جاتے رہے ہیں۔ ان دعوتوں اور حکومت کے حلقوں میں آنے جانے کی وجہ سے ان میں اپنے اوپر اعتماد اور بھی مضبوط ہو گیا۔ بڑی ہشیاری سے ضروری معلومات حاصل کرتے رہے اور ساتھ ساتھ نظم و نسق کے ساتھ تعلقات مضبوط کر لیے جن کا انہیں آگے چل کر بہت فائدہ ہوا۔ اب انہیں پوری طرح یہ یقین ہو چلا تھا کہ ان جیسی صلاحیتوں کا کوئی لیڈر مشرقی پاکستان میں موجود نہیں، وہ یہ بھی سمجھ بیٹھے کہ حزبِ اختلاف بالکل بے اثر اور بے طاقت ہے، وہ اپنے آپ کو اس پوزیشن میں پا رہے تھے

جہاں سے وہ بیک وقت حکومت اور حزبِ اختلاف پر حملے کر سکتے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے خفیہ طور پر منصوبہ بندی کی اور اس منصوبہ بندی میں اپنے قریبی احباب بھی شامل نہ کیے۔

ذہن میں تیار کیے ہوئے پلان کے مطابق انہوں نے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلا مرحلہ اعداد و شمار جمع کرنے کا تھا۔ یہ کام مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۰ء سے شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صادق شماریات کے ڈائرکٹر تھے اور وہ ہر سال مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے علیحدہ علیحدہ اعداد و شمار شائع کرتے تھے۔ ان کے علاوہ متعدد ماہرین معاشیات مختلف مسائل پر خاص نقطۂ نگاہ سے کام کر رہے تھے۔ شیخ صاحب نے ان ماہرینِ معاشیات اور "چند اونچے لوگوں" کی مدد سے مشرقی پاکستان کی معیشت کا ایک خاکہ تیار کیا اور پھر اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں اس کے اندر رنگ بھرنے لگے۔

ستمبر کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان میں جو ماحول ابھرا، وہ شیخ صاحب کے عزائم کو بروئے کار لانے کے لئے خاصا سازگار تھا۔ فائر بندی کے کچھ دن ہی بعد ایسی داستانیں فضا میں چھوڑ دی گئیں جو یہ ثابت کرتی تھیں کہ جنگ کے دوران میں مشرقی پاکستان بالکل بے سہارا اور تمام دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ چرچے عام ہونے لگے۔ ان داستانوں میں صداقت کم اور مبالغہ زیادہ تھا۔ اس خاموش پراپیگنڈے سے اذہان متاثر ہوتے رہے۔ عین انہی ایام میں اعلانِ تاشقند ہوا۔ مشرقی پاکستان میں اس اعلان کا ملا جلا ردِ عمل تھا، لیکن مغربی پاکستان میں عوام کے جذبات بہت بھڑے ہوئے تھے۔ وجہ ظاہر تھی۔ حزبِ اختلاف نے اعلانِ تاشقند پر غور کرنے اور متبادل تجاویز پیش کرنے کے لئے لاہور میں کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس یہی کانفرنس ایک دھماکا ثابت ہوئی۔

شیخ صاحب نے کانفرنس کے موقع پر طاقت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ موقع ان کے لیے سب سے زیادہ سازگار تھا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ لاہور کانفرنس کو سبوتاژ کیا جائے تاکہ حزبِ اختلاف پر اتنی کاری ضرب لگ جائے کہ وہ پھر مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے مدِ مقابل نہ آ سکے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ حکومت اس اقدام کو سراہے گی اور انہیں خوب پبلسٹی ملے گی، بعد میں وہ اس پبلسٹی کے

زور پر حکومت سے دو دو ہاتھ کر لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب شیخ صاحب لاہور آئے، تو وہ اس وقت مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اور پاکستان عوامی لیگ کے صدر نوابزادہ نصر اللہ تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ صاحب نے شیخ صاحب سے کہا: آپ اعلانِ تاشقند کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کریں۔ شیخ صاحب نے جواب دیا: میں اتنے اہم مسئلے پر صلاح مشورہ کئے بغیر کیسے کچھ کہہ سکتا ہوں اس پر نوابزادہ بولے: تم جماعت سے منظوری لیے بغیر چھ نکاتی فارمولا تو پیش کر سکتے ہو، مگر اعلانِ تاشقند کے بارے میں جس کے نکات اور مضمرات اب بالکل واضح ہو چکے ہیں، کچھ نہیں کہہ سکتے۔

یہ ہے اس شخص کا غیر جمہوری رویّہ جو ملک میں جمہوریت قائم کرنے کا سب سے بڑا علمبردار بنا ہوا ہے۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ شیخ صاحب نے چھ نکاتی فارمولے کا تفضل حسین صاحب ایڈیٹر اتفاق سے بھی ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ظہیر الدین صاحب بھی جو شیخ صاحب کو ذہنی غذا فراہم کرتے ہیں اس فارمولے سے بے خبر تھے۔ آخر یہ کون سا طریقہ ہے جمہوری طریقے پر مسائل حل کرنے کا۔ اصولی بات یہ تھی کہ شیخ صاحب اسے جماعت سے منظور کرواتے اور پھر اس کے لئے جمہوری طریقوں سے زمین ہموار کی جاتی۔ بعد میں انہوں نے چھ نکات کی وضاحت میں ایک پمفلٹ لکھا جس کے اہم مندرجات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ——— اس پمفلٹ میں "میں" "میری" اور "میرا" کے الفاظ ۲۷ بار استعمال ہوئے ہیں، گویا ایک ڈکٹیٹر اپنی مرضی ملک پر ٹھونسنا چاہتا ہے۔

شیخ صاحب نے جو اندازے قائم کیے تھے، وہ بالکل درست ثابت ہوئے۔ انہوں نے لاہور کانفرنس کو بڑی حد تک ناکام بنا دیا اور اس کے صلے میں شیخ صاحب کو ان اخبارات نے بڑھ چڑھ کر پبلسٹی دی جو ٹرسٹ کے اخبار کہلاتے ہیں مورننگ نیوز ڈھاکہ نے ۱۰ فروری کو گیارہ انچ جگہ میں سب سے پہلے یہ خبر چھاپی کہ مشرقی پاکستان عوامی لیگ لاہور کانفرنس سے بے تعلق رہی۔ دوسرے روز دو کالمی سرخی کے ساتھ یہ مژدہ سنایا گیا کہ عوامی لیگ متحدہ حزب اختلاف کے حق میں نہیں۔

۱۱ فروری کو مجیب صاحب ڈھاکے پہنچے اور انہوں نے ایئرپورٹ پر اخبار نویسوں کو چھ نکات

کے سلسلے میں ایک تفصیلی انٹرویو دیا۔ مختلف اخبارات نے ان چھ نکات کو جتنی جتنی جگہ دی، وہ قارئین کی دلچسپی کے لیے درج کی جاتی ہے۔

ڈیلی پاکستان ۱۲ر فروری

۶ کالمی فرسٹ ڈوڈن لیڈ۔ دو سطروں میں سرخی، ہر سطر ایک انچ موٹی۔ سرخی کے الفاظ یہ ہیں:
لاہور کے حزبِ اختلاف کے ٹولے نے ہم سے غداری کی۔ (مجیب الرحمٰن)۔ چھ نکات کی وضاحت کے لیے ۳۲ر انچ وقف کیے گئے ہیں۔

مورننگ نیوز ۱۳ر فروری

فرسٹ لیڈ۔ تین کالمی سرخی تین لائنوں میں۔ الفاظ یہ ہیں، مجیب وفاقی حکومت کی حمایت کرتا ہے۔ یہ خبر ۲۱ر انچ پر پھیلی ہوئی ہے۔

پاکستان آبزرور ۱۲ فروری

آخری صفحے پر ایک کالمی سرخی۔ ۲۰ر انچ میں چھ نکات کی وضاحت موجود ہے۔

منگ باد ۱۲ر فروری

صفحہ نمبر ۳ پر چار کالمی سرخی۔ عنوان یہ ہے:
"ہمارا تاشقند کے مخالفین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔ ۲۹ر انچ میں چھ نکات کی وضاحت کی گئی ہے۔

آواز۔ کوئی خبر نہیں دی گئی

آزاد ۱۲ر فروری

پہلے صفحے پر دو کالم کی غیر نمایاں خبر۔ صرف ۱۸ر انچ دیے گئے ہیں۔ عنوان ہے:
"لاہور کانفرنس کے خلاف مجیب کے الزامات"

اتفاق ۱۲ر فروری

فرسٹ لیڈ چار کالموں پر مشتمل ہے۔ سُرخی کے الفاظ یہ ہیں:

"مشرقی پاکستان کے پانچ کروڑ عوام کے خلاف سازش" یہ داستان ۱۵ انچوں پر پھیلی ہوئی ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات آئندہ کام آئیں گی۔

۱۲ فروری سے لے کر ۲۸ فروری تک مختلف اخبارات کا رویّہ مختلف رہا۔ "اتفاق" جو عوامی لیگ کا ترجمان ہے، پہلے صفحے پر جلی سرخیوں کے ساتھ مجیب الرحمٰن صاحب کی وضاحتیں اور سرگرمیاں چھاپتا رہا۔ ۲۸ فروری تک شیخ صاحب کا پراپیگنڈہ اتفاق کے ۲۱۷ انچوں پر پھیل چکا تھا۔ چھ نکات کے حق میں سب سے پہلے ایسٹ پاکستان سنٹرل میڈیکل کالج سٹوڈنٹس یونین کے صدر کا بیان شائع ہوا۔ اس کے بعد ڈھاکہ بار ایسوسی ایشن کے دو ارکان نے بیان دیا کہ چھ نکات ہمارے دل کی آواز ہیں۔ اتفاق نے مجیب الرحمٰن کی سرگرمیاں اس انداز سے پیش کیں جیسے پورا صوبہ اس کی آواز پر لبیک کہہ رہا ہے۔

پاکستان آبزرور کا رویّہ ۲۸ فروری تک عوامی لیگ کے خلاف رہا۔ وہ چُن چُن کر ایسی خبریں چھاپتا رہا جن سے عوامی لیگ کے اختلافات عوام کے سامنے آجائیں۔

آواز نے چھ نکات کی حمایت میں تین اداریے لکھے۔ ایک اداریے میں مشرقی پاکستان کے وزیرِ قانون عبدالحیٔ صاحب کی تقریر پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ باقی تین اداریوں میں چھ نکات کے مختلف پہلو دلائل کے ساتھ واضح کیے گئے۔ آزاد، بالکل خاموش رہا۔ مورننگ نیوز میں صرف کونسل مسلم لیگ کے قائدین کے بیانات چھ نکات کے خلاف شائع ہوئے (۱۰ انچ) اور ۲۸ انچ میں مجیب الرحمٰن کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور عوامی لیگ ورکنگ کمیٹی کی روداد شائع ہوئی۔ ڈیلی پاکستان نے ۴۲ انچ میں دو سیاسی قائدین کے بیانات چھ نکات کے خلاف شائع کیے۔ ان میں ایک بیان مولانا مودودی کا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ چھ نکات میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین شدید نفرت کے بیج پائے جاتے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن صاحب نے ۲۰، ۲۱ فروری کو عوامی لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اپنے مکان پر بلوایا۔ اس میں صرف آٹھ اشخاص نے شرکت کی۔ اس کمیٹی سے شیخ صاحب نے چھ نکات کی منظوری حاصل

کرلی۔

یکم مارچ کی نشری تقریر میں صدرِ مملکت نے مشرقی پاکستان میں انتشار پسندوں کا خصوصی ذکر کیا، فرمایا:

ان پر کڑی نظر رکھی جارہی ہے۔ صدرِ پاکستان کی تنبیہہ نے فہمیدہ طبقے میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا، تاہم اخبارات کسی قسم کے ردِ عمل سے خالی تھے۔

اَب تک سیاسی جماعتوں کی صورتِ حال یہ تھی کہ مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے ایک چھوٹے سے ٹولے کے سوا اور کوئی سیاسی جماعت مجیب الرحمٰن کے حق میں نہ تھی۔ شیخ صاحب کے چھ نکات سے مغربی پاکستان میں شدید مخالف ردِ عمل ہوا تھا، چنانچہ اسی لیے وہاں کی سیاسی جماعتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تین چار بڑے بڑے لیڈر مشرقی پاکستان جائیں اور وہاں کے عوام کو بتائیں کہ چھ نکات سے سیاسی اتحاد کو سخت نقصان پہنچے گا۔ نواب زادہ نصر اللہ صاحب کو مشرقی پاکستان جانے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ چودھری محمد علی اور مولانا مودودی عازمِ ڈھاکہ ہوئے۔ شیخ صاحب ان دونوں شخصیتوں سے سخت خائف تھے، اسلیے انہوں نے اپنے پمفلٹ میں ان دونوں حضرات کو صدر ایوب کا ایجنٹ قرار دیا اور خوب بے نقط سنائیں۔ بدقسمتی سے مشرقی پاکستان کے گورنر صاحب عجلت میں ایک ایسا بیان دے گئے جس نے صورتِ حال بدل کر رکھ دی۔ چھ مارچ کو ان کا یہ بیان اخبارات میں . . . . خصوصاً ٹرسٹ کے اخبارات میں، نمایاں سرخیوں کے ساتھ چھپا جس میں کہا گیا تھا کہ مغربی پاکستان سے آنے والے شر پسند لیڈروں سے ہشیار رہیں۔ جن شخصیتوں کو شیخ صاحب گھائل کرنا چاہتے تھے۔ انہی پر حکومت کی طرف سے تیر چلا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اگلے روز مورننگ نیوز اور ڈینک پاکستان میں چودھری محمد علی کا یہ بیان پہلے صفحوں پر شائع ہوا کہ چھ نکاتی پروگرام انتہائی افسوسناک (UNFORTUNATE) ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے بیان بازی شروع نہ ہوتی تو چودھری محمد علی اور مولانا مودودی کم از کم چھ نکات کی حد تک مجیب الرحمٰن کے خلاف ایک مضبوط بند ثابت ہوتے۔

اس سیاسی گہما گہمی میں آبزرور نے اپنا رویہ تبدیل کرلیا۔ آواز، ۲ فروری سے بالاقساط چھ نکات کے حق میں اداریے لکھ رہا تھا۔ اس نے پانچ اداریے لکھے اور مطالبۂ خود مختاری کی پر زور حمایت کی۔ اب آبزرور نے بھی اپنے ہاتھ دکھانے شروع کیے۔ صدرِ پاکستان نے سات، آٹھ اور نو مارچ کو ڈھاکہ میں جو تقریریں کیں، وہ بہت تند و تیز تھیں۔ آبزرور نے ان تقریروں کی سرخیاں کچھ اس طرح جمائیں کہ نشتریت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ آواز نے دس مارچ کو ایک اداریہ لکھا۔ عنوان تھا:

مضبوط مرکز اور علاقائی خود مختاری۔ اداریے کا آغاز اس بات سے ہوا کہ ماضی میں بھی مغربی پاکستان کے لوگ ہمیں برا بھلا کہتے آئے ہیں۔ لیاقت علی خاں مرحوم نے ہمارے قائدین کو کتا کہا تھا۔ موجودہ حکومت بھی ہمیں انتشار پسند اور غدار کہتی ہے۔ اس قسم کے حربے ہمارے مطالبے کو دبا نہیں سکتے۔

صدرِ پاکستان کی جس تقریر سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سنجیدہ طبقوں میں زلزلہ سا آگیا، وہ ۲۰ مارچ کی تقریر تھی۔ مختلف اخبارات نے اس تقریر کی مختلف سرخیاں لگائیں۔ دو چار آپ بھی دیکھیے:

آزاد

(تین کالمی، فرسٹ لیڈ، تین سطری، ہر سطر ایک انچ موٹی) "تخریب پسندوں کے خلاف متحد ہو جائیے، خانہ جنگی چھڑ سکتی ہے۔"

آبزرور

(تین کالمی، تین سطری، ہر سطر ڈیڑھ انچ موٹی) "قوم کو خانہ جنگی کا بھی مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔"

سنگ باد

(فرسٹ لیڈ، تین کالمی سرخی) خانہ جنگی کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔

ڈیلی پاکستان

(چھ کالمی، فرسٹ لیڈ) حزبِ اختلاف کے چھ نکات پر صدر کی تنقید۔ اہلِ وطن کو خانہ جنگی کے لیے

تیار ہونا پڑے گا۔

اتفاق

(سیکنڈ لیڈ، دو کالم) پاکستان مسلم لیگ سے صدر کا خطاب۔ خانہ جنگی کی دھمکی۔

مورننگ نیوز

ملک کی سالمیت پارہ پارہ نہیں ہونے دی جائے گی۔ چیلنج قبول کیجئے —— ایوب عوام سے اپیل کرتے ہیں۔

اس تقریر کے چھپتے ہی مخالف جماعتوں کے قائدین میدان میں آ گئے۔ تمام اخبارات میں شدید ردِ عمل نمودار ہوا۔ آبزرور نے پہلی بار اداریے میں لکھا کہ خود مختاری کا مطالبہ کسی ایک طبقے کا مطالبہ نہیں، یہ پورے مشرقی پاکستان کے دل کی آواز ہے۔ اتفاق میں مسافر کے قلم سے صدرِ پاکستان کی تقریر پر سخت تنقید کی گئی اور شیخ صاحب نے اپنے احباب سے کہا:

"صدر صاحب کی اس تقریر نے ہمارے لیے آدھا میدان فتح کر دیا ہے۔"

مشرقی پاکستان کے ایک تجربے کار اخبار نویس نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا:

"لوگوں نے صدرِ پاکستان کی ۲۰ مارچ کی تقریر کے بعد چھ نکات کو اہمیت دینا شروع کی۔ عوام یک لخت بھونچکا رہ گئے کہ کونسا طوفان اُمڈ آیا ہے، چنانچہ لوگوں نے چھ نکات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ دفتروں کے ملازمین ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ صدرِ پاکستان نے اتنی سخت تقریر کس بنیاد پر کی ہے۔ چند ہی دنوں میں چھ نکات کے بارے میں گاؤں گاؤں، قریہ قریہ باتیں ہونے لگیں۔ صدر صاحب جب ڈھاکہ سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہونے لگے، تو انہوں نے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ضرورت پڑنے پر ہتھیاروں کی زبان استعمال کریں گے۔"

بس پھر کیا تھا، عوامی لیگ کے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار آ گیا۔ اس کے کارکنوں نے، جو ماضی

میں بھی اسی انداز کے ہتھکنڈوں سے برسرِ اقتدار آئے تھے، "ہتھیاروں کی زبان" کو خوب ہوا دی اور ساتھ ہی یہ تاثر بھی دیتے چلے گئے کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ان باتوں میں بڑی جذباتی کشش تھی، عوام متاثر ہوتے چلے گئے۔ حکومت نے اس سلسلے میں دس روز تک کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سب سے پہلا وضاحتی بیان عبدالصبور صاحب نے ۲۰ مارچ کو دیا۔ ایک ماہر سیاسیات کا تاثر یہ تھا:۔

"حکومت اور پاکستان مسلم لیگ کے قائدین کی طرف سے اب تک جس قدر بیانات شائع ہوئے تھے، ان میں دلائل کم اور تخریب، انتشار، علیحدگی، عظیم بنگال، آزادی خطرے میں ہے، ملک پارہ پارہ ہو جائے گا، کے الفاظ زیادہ۔" دوسری طرف شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اخبارات میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ جن میں اعداد و شمار کی بھرمار، ماضی کے واقعات کی تصویر کشی اور مشرقی پاکستان سے زیادتیوں کے آنکھوں میں آنسو لے آنے والے تذکرے تھے۔ سب سے پہلے ۴ مارچ کو اتفاق میں تفضل حسین صاحب کا ایک طویل مقالہ چھپا۔ یہی مقالہ آبزرور میں ۶ مارچ کو شائع ہوا۔ آگے چل کر اس اخبار نے حکومت کے موقف کے خلاف چار اداریے لکھے۔ ۱۹ مارچ کے "آواز" میں مجیب صاحب کا مدلل مقالہ نمودار ہوا۔ اس سے قبل یہ اخبار چھ نکات اور خود مختاری کے موضوع پر ۱۶ اداریے لکھ چکا تھا۔ ان مقالوں اور اداریوں کے جواب میں ٹرسٹ کے اخبارات میں کچھ نہیں چھپا۔ ڈینک پاکستان نے "صدر کی اپیل" اور "قومی وحدت" کے عنوان سے دو اداریے لکھے، مگر یہ دونوں بے جان سے تھے۔

شیخ صاحب نے ایک طرف تمام مخالف جماعتوں اور حکومت سے جنگ جاری رکھی اور دوسری طرف عوامی لیگ پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ظہیر الدین اور مولوی عبدالرشید ترکا بگش، شیخ صاحب کے لیے مضبوط حریف بن سکتے تھے، مگر ظہیر الدین صاحب میں وہ حوصلہ اور جرأت نہیں جس کے مجیب صاحب مالک ہیں، اس لیے دونوں پیچھے ہٹ گئے اور شیخ صاحب مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ عجب ہے یہ سیاسی جماعت جس نے شیخ صاحب کا محاسبہ نہ کیا کہ انہوں نے منظوری لیے

بغیر چھ نکات کا پروگرام اپنے طور پر کیسے نشر کردیا تھا، انہی بے اصولیوں تے ماضی میں سیاسی جماعتوں کو رسوا کیا اور یہی بے قاعدگیاں ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

شیخ صاحب نے صدر منتخب ہونے کے بعد پلٹن میدان میں ولولہ انگیز تقریر کی۔ اتفاق کی اطلاع کے مطابق اس وقت طوفانِ بادوباراں زوروں پر تھا۔ لیکن حاضرین مُقرر کی سحرکاریوں میں اس طرح بے خود تھے کہ ان میں سے ایک بھی نہ اٹھا۔ شیخ صاحب کی تقریر کے تیور یہ تھے:

"کوئی دھمکی ہمیں مرعوب نہیں کرسکتی۔ ہم ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے ساتھ پچھلے اٹھارہ برسوں میں جو کچھ ہوتا رہا، وہ انگریزوں کی دوصد سالہ غلامی سے بھی بدتر ہے۔"

اتفاق کی پالیسی عجیب و غریب تھی۔ تفضل حسین صاحب نے چھ نکات کے حق میں یا صدرِ پاکستان کی تقریروں کے خلاف ایک بھی اداریہ نہیں لکھا، لیکن مسافر (وہ خود ہی ہیں) کے قلم سے چھ نکات کے مخالفین پر تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے۔ خبروں کی ترتیب یہ تأثر دیتی تھی کہ مشرقی پاکستان میں صرف شیخ مجیب الرحمٰن رہتے ہیں۔ مارچ کے مہینے میں شیخ صاحب اور عوامی لیگ کی سرگرمیوں کو ۱۹، ۱۷ انچ جگہ ملی۔ جلسوں کی تصویریں پہلے صفحے پر شائع ہوتی تھیں۔ اتفاق کے مطالعے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مشرقی پاکستان کا ذرہ ذرہ چھ نکات کے لیے دھڑک رہا ہے۔

اپریل کے مہینے میں عوامی لیگ کی سرگرمیاں اور تیز ہوگئیں۔ سرکاری پارٹی کی طرف سے دیے ہوئے اکثر بیانات مجیب الرحمٰن کی تقویت کا باعث بن رہے تھے۔ ایک بیان میں گورنر مشرقی پاکستان نے حزبِ اختلاف پر بھرپور وار کیا۔ وہ چودھری محمد علی کو نشانہ بنانا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے کہا:

چودھری محمد علی کے زمانے میں مرکزی سیکرٹریٹ میں ۱۳ سیکرٹری تھے جن میں سے ایک بھی مشرقی پاکستان کا نہ تھا۔ ۱۹ جائنٹ سیکرٹریوں میں سے صرف ایک مشرقی پاکستان سے متعلق تھے۔ ۵۹ ڈپٹی سیکرٹریوں میں صرف چار مشرقی پاکستان کے تھے۔ یہ اعداد و شمار شیخ صاحب نے اپنے حق میں استعمال کیے اور کہا:

مرکزی سیکریٹریٹ میں اب بھی صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نہیں، ہم اسی عدم مساوات کو دور کرنے کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں۔

۱۲ اپریل سے بھٹو، مجیب مناظرے کی بحث ڈرامائی انداز اختیار کر گئی۔ بھٹو صاحب نے، خبر نہیں، کیا سوچ کر شیخ صاحب کو چیلنج دیا تھا کہ وہ ان کی پسند کے مقام پر عام جلسے میں مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس چیلنج میں گہرے دُور رس نتائج مضمر تھے۔ جن کا اندازہ بھٹو صاحب کو شروع میں نہیں ہوا۔ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری تاج الدین صاحب نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور ۲۸ مارچ کی تاریخ مقرر کر دی، مگر یہ بڑھتے بڑھتے ۲۴ اپریل تک پہنچ گئی۔ بھٹو صاحب نے ۲۴ اپریل کے بجائے ۱۷ اپریل مقرر کی۔ لیکن عین ایک دن پہلے پیچھے ہٹ گئے۔ ٹرسٹ کے اخبارات بھٹو صاحب کے چیلنج کو اتنی زیادہ پبلسٹی دے چکے تھے کہ جب بھٹو صاحب نے دامن بچانا چاہا تو مختلف اخبارات نے بہت دلچسپ سُرخیاں جمائیں۔ آپ بھی ایک جھلک دیکھ لیجیے پہلے ہم ٹرسٹ کے اخبارات کی سُرخیاں درج کرتے ہیں:

ڈینک پاکستان نے ۱۴ اپریل کو پہلے صفحے پر شہ سرخی جمائی۔ یہ سُرخی دو سطروں میں تھی اور ہر سطر دو انچ موٹی تھی۔ الفاظ یہ تھے:

چھ نکات کے سوال پر عام جلسے میں مجیب بھٹو کا چیلنج قبول کرتا ہے۔

مورننگ نیوز نے پہلے صفحے پر دو کالم میں تین سطری سرخی جمائی:

۱۷ اپریل

کو

مجیب بھٹو کا آمنا سامنا

اتفاق نے یہ خبر ۵ مم انچ میں دی۔ اس کا عنوان چار سطروں میں تھا۔ الفاظ یہ ہیں:

۱۷ اپریل کو دو دو ہاتھ ہوں گے۔

مجیب کہتا ہے:

میں تیار ہوں، مگر بند کمرے میں نہیں۔

بھٹو کہتا ہے:

میں تیار ہوں، مگر چوبیس تاریخ کو نہیں۔

آبزرور کی سُرخی یہ تھی:

مجیب بھٹو کو جلسۂ عام میں دعوت دیتا ہے۔

آبزرور نے پہلے صفحے پر چوکھٹے میں سُرخی جمائی:

بھٹو

مجیب کا سامنا

کرنے کے لیے تیار ہے۔

جب بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ میں تو تیار ہوں، لیکن صوبائی مسلم لیگ اس کے حق میں نہیں ہے، تو مختلف اخبارات کے ردِ عمل یہ تھے:

اتفاق نے پہلے صفحے پر ۴ انچ میں مجیب صاحب کا بیان شائع کیا جس کی سُرخی یہ تھی:

اصولی طور پر چھ نکات کی فتح ہوئی ہے۔

آواز نے ۱۵ اپریل کو سیکنڈ لیڈ دی:

بھٹو بھاگ گئے۔

اس کے بعد اگلے دن اداریہ لکھا، جس کا عنوان تھا:

جو بھاگ جاتے ہیں، وہ بچ جاتے ہیں۔

آبزرور نے ۱۶ اپریل کو نہایت دلچسپ سُرخی جمائی۔

بھٹو کا بھاٹا (جوار بھاٹا) ہو گیا۔

آبزرور کے سیاسی مبصر نے بہت مزے لے لے کر مجیب بھٹو آنکھ مچولی کی روداد شائع کی۔

اس کا لب لباب اس مصرع میں آجاتا ہے۔ ؎

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ابھی مجیب بھٹو مقابلے کے تذکرے فراموش نہ ہوئے تھے کہ ۱۸ اپریل کو شیخ صاحب کی گرفتاری کا مرحلہ پیش آگیا۔ وہ جیسور تقریر کرنے گئے ہوئے تھے۔ انہیں وہاں گرفتار کر لیا گیا۔ شیخ صاحب چاہتے بھی یہی تھے۔ انہوں نے اس گرفتاری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انہیں جیسور سے ڈھاکہ لایا گیا۔ راستے میں جس سٹیشن پر گاڑی رکتی، شیخ صاحب مسافروں کو خطاب کرنا شروع کر دیتے۔ جب لوگ یہ دیکھتے کہ شیخ صاحب پولیس کی حراست میں ہیں، تو ان کے اندر جوش و خروش کا پیدا ہونا بالکل فطری تھا۔ الغرض مجیب صاحب جذبات کا طوفان اٹھاتے ہوئے ڈھاکہ پہنچے وہ بعد میں ضمانت پر رہا ہو گئے، لیکن ان کی گرفتاری کام کر چکی تھی۔

۲۱ اپریل کو انہیں ڈھاکہ میں دوبارہ گرفتار کر کے سلہٹ بھیج دیا گیا۔ لوگ اس ڈرامے میں گہری دلچسپی لینے لگے۔ اخبارات میں خبر چھپی کہ سلہٹ کے سیشن جج نے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی۔ دو دن بعد یہ درخواست منظور کر لی گئی۔ جونہی شیخ صاحب رہا ہوئے۔ انہیں اسی وقت پھر گرفتار کر لیا گیا۔ ڈرامے کے واقعات بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

عوامی لیگ نے، جو جذبات سے کھیلنے کے فن میں طاق ہے، اس صورتِ حال کو ایسا جذباتی رنگ دیا کہ عوام اپنے دلوں میں شیخ صاحب کے لیے جگہ بنانے لگے۔ اتفاق کی رپورٹ کے مطابق ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں عوامی لیگ کے رہنماؤں نے جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کیا۔ عوام کے جذبات کو شعلوں میں تبدیل کرنے کے لیے انتہائی کامیاب تکنیک استعمال کی گئی۔ جلسے میں صدارت کی کرسی خالی رکھی گئی۔ جب حاضرین کرسی خالی دیکھتے، تو ان کے سینے میں ہوک سی اٹھتی۔ اتفاق نے اس جلسے کی روداد ۱۷ انچوں میں شائع کی۔ پہلے صفحے پر چھ کالم کی شہ سرخی جمائی۔ گویا اس جلسے میں پوری دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے۔

۲۶ اپریل کو شیخ صاحب رہا ہو کر آ گئے۔ رہا ہوتے ہی وہ صوبے کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے اتفاق نے جو گاؤں گاؤں پہنچایا تھا۔ جلسوں کی خبریں بہت تفصیل سے دیں۔ شیخ صاحب کو اپنے عزائم کامیاب ہوتے نظر آ رہے تھے۔

یکم مئی کو چٹاگانگ میں ایک انتہائی ناخوشگوار حادثہ پیش آیا، عوامی لیگ نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اس حادثے کی آگ سے اپنے مفاد کی ہنڈیا پکانے کی کوشش کی۔ اس حادثے کی ضروری باتیں بیان کیے دیتا ہوں:

چٹاگانگ میں ایک بنگالی لڑکے کی ایک غیر بنگالی لڑکی سے محبت ہو گئی۔ کہتے ہیں انہوں نے آپس میں شادی کر لی۔ لیکن لڑکی والوں نے اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا۔ ایک سال تک مقدمہ عدالتوں میں چلتا رہا۔ عدالت نے لڑکے کو قید کی سزا دی۔ اس واقعے کو سیاسی رنگ دے دیا گیا اور ہزاروں لوگ جیل کے سامنے جمع ہو گئے۔ پولیس کو نظم و نسق کو قابو میں رکھنے کے لیے سخت کارروائی کرنی پڑی۔ اس پر معاملہ اور سنگین ہو گیا۔ مشتعل ہجوم نے تین چار گھنٹے تک شرمناک غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا جو مرد اور عورتیں بنگلہ پڑھ نہیں سکتی تھیں۔ انہیں زدوکوب کیا گیا۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہا۔ رات کے نو بجے صورت حال پر قابو پایا گیا۔ لاقانونیت کے بھیانک مناظر سے عوام سہمے ہوئے تھے، عوامی لیگ نے قانون شکنوں کی پشت پناہی شروع کر دی۔ اسے ملک کے مفادات سے زیادہ اپنے مفاد عزیز تھے، مگر یہ بات عوامی لیگ کے خلاف گئی۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو سخت دھچکا لگا۔

اس میدان میں شکست کھا کر عوامی لیگ نے اپنا پرانا میدان منتخب کیا، وہ میدان تھا مخالف جماعتوں کے جلسوں میں گڑبڑ پیدا کرنا۔ بدقسمتی سے عوامی لیگ کے مقابلے میں صرف دو جماعتیں سرگرم تھیں۔ ایک پاکستان مسلم لیگ اور دوسری جماعتِ اسلامی۔ پاکستان مسلم لیگ زیادہ تر محدود جلسے کرتی تھی۔ اس کا دائرۂ عمل بنیادی جمہوریتوں تک تھا۔ جماعتِ اسلامی بڑے بڑے شہروں میں بڑے جلسے کر رہی تھی، عوامی لیگ ان جلسوں میں ہڑبازی پر اتر آئی۔ کھلنا میں اس نے ایسا ہی کیا۔ جماعتِ اسلامی کے ساتھ

المیہ یہ ہوا کہ اس کے جلسوں کی رُوداد اخبارات میں جگہ نہ پا سکی۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ عوام کو یہ احساس نہ ہو سکا کہ عوامی لیگ کے خلاف دوسری سیاسی جماعتیں منظم کام کر رہی ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوامی لیگ کے ان بھونڈے ہتھکنڈے نے عوام پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہیں کیے۔ لوگ یہ محسوس کرنے لگتے کہ اگر اس جماعت کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا، تو یہ بڑی سے بڑی بے اصولی کا ارتکاب کر گزرے گی۔

شیخ صاحب کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ۸ مئی کو نرائن گنج میں جلسہ ہوا جس میں آدم جی مل کے ورکروں نے بہت بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ اس جلسے میں عوام کی طرف سے شیخ صاحب کو گولڈ میڈل پیش کیا گیا۔ مجیب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہماری جدوجہد دس کروڑ عوام کی جدوجہد ہے، ہماری کامیابی کی راہ میں کوئی طاقت حائل نہیں ہو سکتی۔"

اگلے ہی روز شیخ صاحب گرفتار کر لیے گئے۔ اس گرفتاری کے بعد عوامی لیگ نے اپنی مہم اور تیز کر دی۔ ۲۵ مئی کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے محبوب لیڈروں کی گرفتاری پر احتجاج کے لیے سات جون کو پورے صوبے میں مکمل ہڑتال کریں۔

اتفاق کے ساتھ ساتھ آبزرور نے بھی خودمختاری کے مطالبے کو نمایاں جگہ دینی شروع کر دی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا، جب پہلے صفحے پر مطالبۂ خودمختاری کی لیڈ نہ ہو۔ آواز کا لہجہ اور تند ہو گیا تھا وہ بڑی بیباکی سے چھ نکات کے مخالفین پر بھرپور حملے کر رہا تھا۔ عوامی لیگ پمفلٹ پر پمفلٹ لا رہی تھی اور انتہائی مؤثر زبان میں عوام کے جذبات کو گرما رہی تھی۔ چھ نکات کے مخالفین کے پاس لٹریچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ ذرا ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ مشرقی پاکستان مسلم لیگ نے ایک قرارداد کے ذریعے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت کے کارناموں پر مشتمل ایک قرطاس ابیض شائع کرے۔ جب میں نے اخبار میں یہ قرارداد پڑھی تو بے اختیار حضرت سیماب کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے
وفا بھی حسن ہی کرتا، تو آپ کیا کرتے

جماعتِ اسلامی نے دو پمفلٹ چھ نکات کے خلاف شائع کیے، مگر اِن میں مجیب الرحمٰن کے جذبات انگیز پمفلٹ کی سی تاثیر کہاں؟ تاہم کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ دلائل و براہین کا میدان خالی پڑا تھا۔ غالباً ذہین طبقہ اس میدان میں اس لیے نہیں نکلا کہ اُسے وزیروں کے بیانات سے یہ تاثر مل رہا تھا کہ چھ نکات کو مشرقی پاکستان کے عوام کی حمایت حاصل نہیں۔

جوں جوں سات جون کی تاریخ نزدیک آتی گئی، سیاسی گہما گہمی میں بے پناہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کسی اخبار نے عوام سے یہ اپیل نہیں کی کہ وہ ہڑتال میں حصہ نہ لیں، بلکہ آواز نے ۶ جون کو اداریہ لکھا جس میں اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہڑتال ضرور کامیاب ہوگی۔ اور کوئی طاقت ہمیں نہیں دبا سکتی۔ ۷ جون کے سنگ باد نے ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے عوامی لیگ کی اپیل شائع کی اور ساتھ ہی اداریہ لکھا جس میں عوام کو تلقین کی گئی تھی کہ وہ ہڑتال میں حصہ لیتے وقت جمہوری اخلاق کو پیشِ نظر رکھیں۔ آزاد نے ۷ جون کو پہلے صفحے پر ۵ کالمی سُرخی جمائی۔ آج عوامی لیگ ہڑتال کر رہی ہے۔ ۴۸ انچوں میں ہڑتال کا پورا پروگرام دیا گیا تھا۔ ۶ جون کو آبزرور میں ہڑتال سے ایک دن پہلے کے تاثرات شائع ہوئے۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ آج شام تک بازاروں میں بے پناہ ہجوم تھا۔ لوگ ضروریات کی چیزیں دھڑا دھڑ خرید رہے تھے۔ سٹاف رپورٹر نے دکان داروں، سبزی فروشوں، ہوٹل کے مالکوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں سے انٹرویو لیے۔ سب نے یہی تاثر دیا کہ ہم مکمل ہڑتال کریں گے۔

اِدھر پچھلے دو تین روز سے گورنر صاحب کے بیانات جلی سُرخیوں کے ساتھ شائع ہو رہے تھے کہ ہم پوری طرح مستعد ہیں، تخریب پسندوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور ہم پُرامن شہریوں کی پوری حفاظت کریں گے۔

آواز نے ۲۴ مئی کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی تھی کہ چھ نکات کے مسئلے پر کنونشن مسلم لیگ میں

اختلاف پایا جاتا ہے۔ ۶ جون کی شام کو یہ افواہ گرم ہوئی کہ ڈھاکہ مسلم لیگ کے ایک با اثر عہدیدار گرفتار کر لیے گئے ہیں (معلوم نہ ہو سکا کہ یہ افواہ بھی یا خبر) چھ جون کی رات ایک پُر اسرار رات نظر آتی تھی۔

۷ جون کی صبح کو شہر کے مختلف علاقوں سے ہجوم آنے لگے۔ پلٹن میدان میں بہت بڑا ازدحام تھا۔ حاضرین "بنگالی بھائی بھائی" کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ منگل کا دن تھا۔ دفتر کھلے تھے۔ لیکن نازک حالات کا احساس کرتے ہوئے کم لوگ گھروں سے باہر نکلے۔ دکاندار چابیاں لیے اپنی اپنی دکانوں کے گرد منڈلاتے رہے لیکن حفاظت کے معقول انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے دکانیں نہ کھول سکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دفعہ ۱۴۴ دن کے گیارہ بجے لگائی۔ سو سے زیادہ مبصرین نے مجھے بتایا کہ آغاز میں جلوس بہت پُر امن تھا، لیکن اچانک مارواڑیوں سے ملتا جلتا ایک گروہ اس جلوس میں شامل ہو گیا اور اس نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں؛ البتہ ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ رات کے آٹھ نو بجے جب ہنگامہ ختم ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ ایک گروہ نے سٹیٹ بنک اور اس سے ملحقہ دفتروں پر حملہ کر دیا۔ ملحقہ دفتروں میں بہت قیمتی ریکارڈ تھا۔ یہ علاقہ ہندو آبادی سے گھرا ہوا ہے۔ یہ چھوٹا سا گروہ بنک اور دفتروں کو آگ لگانا چاہتا تھا۔ پولیس کو سخت اقدامات کرنے پڑے۔ مرنے والوں میں دو ہندو بھی تھے۔

۷ جون کی شام کو آواز نمودار ہوا۔ اس نے ہڑتال کی تفصیلات انتہائی جذباتی انداز میں پیش کی تھیں۔ آپ بھی ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اخبار نے پہلے صفحے پر چار انچ موٹی سُرخی لگائی:

جلوس کے قدموں سے زمین دہلنے لگی۔

انھوں نے سُرخ آنکھوں کا چیلنج قبول کر لیا۔

ان سرخیوں کے بعد اخبار نے ایک شخص کا آنکھوں دیکھا حال تفصیل سے شائع کیا۔ اس نے بتایا:

میں نے کرزن ہال کے قریب کچھ لوگ پڑے ہوئے دیکھے۔ ان کے جسموں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک

طرف بس چل رہی تھی۔ پورے شہر میں فوج اور پولیس گشت کر رہی تھی۔ عوام کے قدموں کی چاپ سے محلات کانپ رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی عظیم الشان ہڑتال تھی، جو صرف ایک سیاسی جماعت کی اپیل پر وجود میں آئی تھی۔

آوازؔ نے ان تفصیلات کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن کی تین کالمی تصویر شائع کی اور اسی کے نیچے ایک نظم شائع کی۔ نظم کا اُردو ترجمہ حاضر ہے:

"گیدڑ شیر کو بند کرنا چاہتے ہیں۔
گیدڑوں نے سانپ کا پھن نہیں دیکھا
انہوں نے آگ کے شعلے بھی نہیں دیکھے
اور برق و شرر سے ساری دُنیا کانپتی ہے
پھر بھی گیدڑ شیر کو بند کرنے چلے ہیں۔"

۸ رجون کا دن انتہائی عجیب و غریب تھا۔ ہر طرف بالکل سناٹا تھا۔ کوئی شخص چھ نکات کے متعلق بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس شہر میں کل کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ ماضی میں تو یہ ہوتا تھا کہ اگر ایک طالب علم یا کوئی سیاسی کارکن مارا جاتا، تو اس کا ردِ عمل بہت شدید ہوتا تھا۔ اس دفعہ کی خاموشی اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کر رہی تھی کہ فائرنگ سے مرنے والوں میں کوئی سیاسی کارکن اور طالب علم نہ تھا۔

۸ رجون کے اخبارات حکومت کے پریس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے۔ آبزرور نے پریس نوٹ کے درمیان چوکھٹا لگایا:

ہم ناموافق حالات کی وجہ سے حادثات پر اپنے نامہ نگار کی رپورٹ شائع نہیں کر رہے۔

۸ رجون کا سنگ باد چھپا ہی نہیں۔ ۹ رجون کی اشاعت میں اس نے ایک بہت بڑے چوکھٹے میں یہ الفاظ درج کیے:

"ہم نے جو کچھ محسوس کیا، اس کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہماری خاموشی ہی ہماری زبان ہے۔ کل شنگ باد شائع نہ ہو سکا۔ ہم مہر بلب ہیں، مگر ہم جانتے ہیں کہ اس خاموشی میں قارئین ہمارے ساتھ ہیں۔"

اسی اخبار نے ہڑتال کا ذکر کیے بغیر، ۷ جون کے واقعات پر انتہائی جذباتی اداریہ لکھا۔ عنوان تھا "موت اور ہم"۔ اداریے میں کہا گیا:

ہمیں معلوم ہے موت کا ایک دن معین ہے۔ حکمرانوں کے ظلم و تشدد سے لوگ مرتے آئے ہیں، اور ہم بھی مظالم کی پرواہ نہیں کرتے۔ آبزرور نے ۷ جون کے واقعات پر ۸ جون کو اڈیٹوریل لکھنا چاہا۔ لیکن وہ چھپا، ۱ جون کو۔ اداریے میں نوٹ دیا گیا ہے کہ ہم نے ۸ جون کے لیے لکھا تھا۔ لیکن واضح وجوہ کی بنا پر اسے اب چھاپ رہے ہیں۔ اس اداریے کا عنوان ہے: "سیکھنے کا سبق"۔ یہ اداریہ بہت متوازن ہے۔ یک طرف حکومت سے اپیل ہے کہ وہ اسے ایک پارٹی یا ایک طبقے کی شر انگیزی پر محمول نہ کرے، اور دوسری طرف ذمہ دار قائدین سے اپیل کی ہے کہ وہ لوگوں میں صحیح شعور پیدا کریں اور ایسی فضا پیدا نہ ہونے دیں جس پر صرف جذبات کی حکمرانی ہو۔

اب فضا بظاہر پُرسکون تھی۔ اچانک ۱۰ جون کو ایک ریل گاڑی نہر میں گر پڑی۔ اس حادثے میں چار افراد مر گئے اور ۲۷ زخمی ہوئے۔ صوبائی ریلوے کے وزیر صاحب نے تحقیق کیے بغیر ایک بیان دے دیا کہ اس میں تخریب پسندوں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان ایک شعلہ ثابت ہوا۔ جذبات ایک بار پھر بھڑک اُٹھے، لیکن اب انتظامیہ کی گرفت مضبوط تھی۔

ادھر عوامی لیگ نے ۱۶، ۱۷ جون کو پورے صوبے میں یوم احتجاج منانے کا فیصلہ کیا، لیکن اب قانون کے پاسبان پوری طرح مستعد تھے۔ اتفاق بند کر دیا۔ جو لوگ امن کے لیے خطرہ تھے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۶، ۱۷ جون کو سیاہ بلے لگانے والوں کی تعداد کسی شہر میں بھی تین چار سو سے زیادہ نہ تھی۔

۱۶، ۱۷ جون کی ناکامی سے عام تاثر یہ ہے کہ چھ نکات کا قضیہ ختم ہو گیا۔ لیکن میرے مشاہدات

اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اخبارات کی بحثوں، ہوٹلوں کی میزوں پر ہونے والی گفتگوؤں اور اندر ہی اندر دوڑنے والی سرد لہروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طوفان سمٹ گیا ہے۔ اور جب طوفان سمٹتا ہے، تو نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ عوامی لیگ اپنے کارکنوں پر ظلم و تشدد کی مبالغہ آمیز داستانیں عام کر رہی ہے، مشرقی اور مغربی پاکستان کے اعداد و شمار اب بھی ذہنوں میں بے شمار سوال اٹھا رہے ہیں۔ اگر معاملہ ختم ہو گیا ہوتا، تو صدرِ مملکت ۵ اگست کو یہ بیان نہ دیتے کہ تخریب پسند ملک کی سالمیت کے درپے ہیں، ان کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔

مورننگ نیوز جون کے وسط سے چھ نکات کے خلاف مؤثر مقالے شائع کر رہا ہے۔ اب اس میں چھ نکات کا تجزیہ بھی ہے اور تشکیلِ پاکستان کا صحیح سیاسی پس منظر بھی۔ کاش! یہ کام پہلے کیا جاتا۔ اِدھر آواز اب بھی بڑی شدت سے چھ نکات کی حمایت کر رہا ہے۔ اس نے بڑی حد تک اتفاق کی جگہ لے لی ہے۔ کوہستان کے مضامین پر وہ انتہائی غیر محتاط اداریے لکھ رہا ہے۔ دو اداریوں کے صرف عنوانات ملاحظہ کیجیے:

"کوہستان کی آنتوں میں سرطان ہوگیا"

"سب گیدڑوں کی ایک ہی بولی"

اس میں کوئی شک نہیں کہ چھ نکات کا اب وہ زور نہیں رہا، لیکن ذہن میں جو لہریں اُٹھتی رہتی ہیں ان کا اندازہ آپ اوپر کی سطح سے نہیں لگا سکتے۔ عوامی لیگ کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اس سے فاش غلطی سرزد ہوئی ہے، ایک طبقہ اس سے نادم ہے لیکن ایک فعال طبقہ اب بھی شکست ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بیگم آمنہ عوامی لیگ کی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئی ہیں۔ ان کی تقریروں کے تیور بتاتے ہیں کہ ان میں جذبات کو اپیل کرنے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے۔ ان کی تقریر کے چند جملے درج کرتا ہوں۔

"مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ میں گھر سے باہر کیوں نکل آئی ہوں۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر

گھر میں آگ لگ جائے، تو گھر کی مالکہ اُسے بجھانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتی ہے۔ میرے ملک میں آگ لگی ہوئی ہے، میں اُسے بجھانے نکلی ہوں۔

"میں ایک ماں ہوں اور میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میرے بچے سڑکوں پر بلکتے پھریں، میری ممتا مجھے باہر لے آئی ہے۔"

یہ اندازِ جنوں بڑا بلا خیز ہے۔ اس کا مقابلہ صرف اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ عوام کے ذہن اور دل فتح کیے جائیں، اور یہ کام صرف معقول دلائل اور محبت کے جذبات سے ہو سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان

کے

حقیقی مسائل

اب ہم مشرقی پاکستان کے اصل مسائل کی نشاندہی کریں گے اور ان کے حل پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ آغاز ہی میں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ میں اقتصادی، عمرانی، انتظامی اور سیاسی امور کا کوئی ماہر نہیں میری سوچ ایک دردمند شہری کی سوچ ہے، علم السیاست میں پڑھا تھا کہ آمرانہ نظام کی پشت پر صرف ایک شخص یا اس کے خوشامدیوں کی سوچ ہوتی ہے، اور جمہوری نظام اپنی غذا ملک کے ہر سوچنے والے دماغ سے حاصل کرتا ہے۔ شاید میرا ننھا سا دماغ ہماری جمہوریت کے کسی کام آجائے۔

مشرقی پاکستان کے مسائل کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ ہے کہ سنگین اور گمبھیر ہونے کے باوجود وہ ایسے نہیں کہ ان کا حل تلاش نہ کیا جا سکے۔ خبر نہیں ہمیں یہ عادت کہاں سے پڑی کہ مسائل کا سامنا کرنے کے بجائے ہم ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقائق چھپانے سے سرگوشیاں جنم لیتی ہیں اور یہ سرگوشیاں مسائل کو پیچیدہ اور غیر معمولی بھیانک بنانے میں بھونڈا کردار ادا کرتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ نظریہ بھی صحیح نہیں کہ مسائل اٹھانے والے لازمی طور پر غیر محب وطن ہوتے ہیں۔ انگلستان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ وہاں کے لوگوں کی حب الوطنی ہمارے سامنے مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے، مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ سکاٹ لینڈ (یہ انگلستان کا ایک حصہ ہے) مرکزی حکومت اور پارلیمنٹ کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ سکاٹ لینڈ کے مسائل کا لب و لہجہ اتنا تلخ اور تند ہو گیا تھا کہ ۱۹۶۱ء میں وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے رائل

کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ انگلستان کے کسی اخبار نے یہ نہ لکھا کہ اہلِ سکاٹ لینڈ ملک کے دشمن ہیں اور کسی نے تقریر میں یہ نہ کہا کہ یہ تو ہمیشہ سے انگلستان کے خلاف سازشیں کرتے آئے ہیں۔

امریکہ دُنیا کا سب سے زیادہ متمدّن اور ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ روپے پیسے کی وہاں خوب ریل پیل ہے۔ سائنس کی ترقی بھی کچھ کم قابلِ رشک نہیں، لیکن کیا وہاں مسائل موجود نہیں؟ کیا پچاس کی پچاس ریاستیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتی ہیں؟۔ جی نہیں، یہ ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف اور وفاق کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ نفرت اس حد تک ہے کہ اگر مرکز مضبوط نہ ہو، تو ایک ریاست دوسری ریاست پر چڑھ آئے اور آئے دن خونریزی کا بازار گرم رہے۔

اسی امریکہ میں، جس کی مستحکم معیشت کے تذکرے سُنتے سُنتے کان پک گئے ہیں، گوناگوں اقتصادی مسائل نظر آتے ہیں۔ شمالی ریاستوں اور جنوبی ریاستوں میں معاشی تفاوت بعض حالات میں سو فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ روس معاشی منصوبہ بندی کے اعتبار سے بہت اچھی شہرت رکھتا ہے۔ وہاں تو تمام علاقوں کی اقتصادی حالت ایک جیسی ہونی چاہیئے، مگر ماسکو اور لینن گراڈ کے علاقوں کا ذرا تاشقند اور سمرقند کے علاقوں سے مقابلہ کرکے دیکھیئے، اتنا بڑا فرق نظر آئے گا کہ آپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اٹلی کے متعلق شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہاں شمالی اور وسطی خطّوں میں ہمیشہ کشمکش رہتی ہے اور ایسے مواقع بھی آئے کہ بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ دونوں خطّوں کی فی کس آمدنی کا تناسب ۵ اور ۲ ہے۔ فرانس بھی اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں جو دُنیا کی بڑی طاقتیں متصوّر ہوتے ہیں۔

مختلف ملکوں کے حوالوں سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ زندہ قوموں کو مسائل سے کوئی مفر نہیں۔ لوگوں کے نفسی رجحانات، تاریخی انقلابات، جغرافیائی کیفیات اور بین الاقوامی اثرات قوموں کی زندگیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں اور مختلف علاقوں میں مختلف ردِّ عمل پیدا کرتے ہیں۔ انسان کپڑا بُننے والی مشین تو نہیں کہ ایک بار چلا دیا، تو وہ ایک جیسا کپڑا تیار کرتی رہے گی۔ یہاں تو بعض اوقات ایک فرد کے دماغ میں اُٹھنے والی ننھی سی لہر پوری قوم کی ہیئت بدل دیتی ہے۔

تاریخی عوامل پر گہری نظر نہ ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے حالات دیکھ کر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے ایک چھوٹے سے طبقے میں انتہا پسندانہ ردِ عمل پیدا ہوا۔ مشرقی پاکستان کے اُس طبقے نے بددل ہو کر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ شاید پاکستان سے علیحدہ ہو کر ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دُنیا میں ایسی خود مختار ریاستیں موجود ہیں جن کی آبادی پچاس ساٹھ لاکھ سے زیادہ نہیں، تو پھر مشرقی پاکستان جس کی آبادی پانچ کروڑ سے زیادہ ہے، ایک آزاد اور خود مختار ریاست کیوں نہیں بن سکتا۔ اس طبقے کے چند لوگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت ہے کہ اگر خدانخواستہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا، تو وہ بھی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ مشرقی حصے کو جنوبی حصے کے خلاف سخت شکایات ہیں۔ دستوری کمیشن نے، جو چیف جسٹس پاکستان، جناب شہاب الدین کی صدارت میں قائم ہوا تھا، اپنی رپورٹ میں لکھا، مشرقی حصے کے لوگوں نے ہم سے علیحدہ صوبے کا مطالبہ کیا۔ ان حالات میں مشرقی پاکستان آزاد ہو کر کتنے دن زندہ رہ سکے گا؟ انہیں میں نے یہ بھی بتایا کہ ڈھاکہ اور چاٹگانگ کے صنعتی اور کاروباری حلقوں میں ایک دوسرے کے خلاف کشمکش سنگین صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف اضلاع میں سخت معاشرتی اور تہذیبی کھچاؤ پایا جاتا ہے۔ اگر کسی کو گالی دینی ہو، تو صرف یہ کہہ دیجئے کہ تو نواکھلی کا رہنے والا ہے۔ کیا بھارت ان حقائق سے واقف نہیں؟ کیا وہ ان کمزوریوں سے فائدہ نہیں اُٹھائے گا؟ خدارا! میرے ان سوالوں کا جواب دیجئے ——— مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

مغربی پاکستان میں بھی انتہا پسند ذہن دیکھنے میں آیا ہے، اس ذہن کے نمائندے یہ کہتے سُنے گئے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ طبیعت کے لحاظ سے ہنگامہ پرور واقع ہوئے ہیں۔ برصغیر ہند کے اسلامی عہد میں بھی یہ علاقہ ہمیشہ مرکز کے خلاف بغاوت کرتا رہا اور اب بھی اس کا وہی طرزِ عمل ہے۔ آپ ان پر کتنا ہی پیسہ خرچ کر دیجئے، وہ بالآخر علیحدہ ہو کر رہیں گے۔ یہ باتیں سن کر سخت صدمہ ہوا۔ ہائے! اس پیارے وطن کے بارے میں، جس کی بنیادوں میں شہیدوں کا پاک خون اور ہڈیاں شامل ہیں، لوگ ایسی بُری بات کہتے ہوئے

ذرا تکلیف محسوس نہیں کرتے۔ میں نے اور میری طرح لاکھوں انسانوں نے آگ کے خون آمیز سمندر میں سے پاکستان کا وجود اُبھرتے دیکھا۔ ہم جیتے جی اس کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہ آنے دیں گے۔ ظالمو! دیکھو تو سہی، اگر جسم میں سے ایک آنکھ نکال لی جائے اور ایک بازو اور ایک ٹانگ کاٹ دی جائے۔ تو پھر کیا باقی رہے گا؟

میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ جذب اور سوز میں ڈوبے ہوئے یہ فقرے زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوئے۔ اس لیے دو اور دو چار کا راستہ اختیار کیا۔ انہیں بتایا کہ اگر خاکم بدہن مشرقی پاکستان علیحدہ ہوگیا، تو پھر مغربی پاکستان بھی متحد نہ رہ سکے گا۔ علیحدگی کی لہر مشرقی پاکستان کو لپیٹ میں لینے کے بعد مغربی پاکستان کی طرف بڑھے گی۔ اگر ملک کا ایک حصّہ علیحدہ ہو جائے، تو دوسرے حصّے بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں مغربی پاکستان میں پختونستان کا سٹنٹ ابھی دبا نہیں، وہ فوراً سر اٹھا لے گا۔ ہوسکتا ہے سرحد بالکل کٹ جائے۔ سندھ میں خود مختاری کو ہوا دینے والے موجود ہیں۔ بلوچستان کی صورتِ حال باخبر لوگوں سے پوشیدہ نہیں۔ الغرض مغربی پاکستان کا یہ علاقہ جو اس وقت وحدت کی ایک خوبصورت لڑی ہے، چند ہی مہینوں میں دانے دانے کی طرح منتشر ہو جائے گا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے کسی ملک کی مثال نہیں ملتی جو بڑا علاقہ کھو دینے کے بعد اپنی آزادی اور سالمیت کو برقرار رکھ سکا ہو۔

مجھے پُورا یقین اور اعتماد ہے کہ مشرقی پاکستان ہم سے کبھی علیحدہ نہ ہوگا۔ جہاں تک عوام کے جذبات اور احساسات کا تعلق ہے، وہ علیحدگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، بلکہ انہیں یہ لفظ سُن کر سخت روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کھلنا میں اَن گِنت لوگوں سے پوچھا:

"کیا تم پاکستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہو؟"

ایک مزدور یہ الفاظ سن کر رو پڑا۔ اس کے موٹے موٹے آنسو میں کبھی نہ بھول سکوں گا اور اس کے چہرے پر پھیلا ہُوا اضطراب مجھے ہمیشہ بے چین کیے رکھے گا۔ اس نے رندھے ہُوئے لہجے میں کہا:

"آپ ہمارے بارے میں ایسی بُری بُری باتیں کیوں سوچتے ہیں؟ کیا ہم یہ کبھی پسند کرسکتے ہیں، کہ

ٹھوکریں کھانے کے لئے پھر ہندوؤں کے غلام بن جائیں۔ یہ بازار جس میں ہم کھڑے ہیں۔ ہندوؤں کے زمانے میں ہمارے لئے بالکل بند تھا، اور وہ جگہ جو دیکھ رہے ہو، وہاں ہم صرف ننگے پاؤں جا سکتے تھے۔ اس شہر میں ایک بھی مسجد نہ تھی۔ ہم گھروں میں چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے، وہ ہمیں اچھوتوں سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ اگر ہم آزادی کی نعمت ٹھکرا کر ہندوؤں کی غلامی قبول کرلیں تو ہم سے زیادہ نادان کون ہوگا۔"

یہ ایک مزدور کی آواز نہ تھی، ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے دل کی دھڑکن تھی۔ میں جہاں بھی گیا، مجھ سے کسی نے اس بنا پر نفرت نہیں کی کہ میں مغربی پاکستان کا رہنے والا ہوں، دیہاتیوں نے سینے سے لگایا اور اہلِ محبت نے آنکھوں میں جگہ دی۔ ایک پانچ سالہ بچی کا پھول سا چہرہ آنسوؤں کی شبنم میں نہایا ہوا مجھے محبت کا ایک ایسا پیام دے گیا جو صبا میں ڈھل گیا اور میرے گلشنِ فکر و نظر کا ایک ایک گوشہ مہک مہک اُٹھا۔ چٹاگانگ میں اپنے ایک بنگالی دوست سے ملنے گیا۔ اس کی ایک بچی تھی، وہ مجھ سے جلد ہی مانوس ہوگئی اور جب میں چلنے لگا، تو مجھ سے لپٹ گئی، پھر اس کی خاموش آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے، اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ ہم نادان خاموش آنسوؤں کی زبان نہیں سمجھتے، تو اُس نے بنگلہ میں کہا:

"چچا، آج نہ جاؤ، ایک رات تو ہمارے پاس ٹھہرو، صبح چلے جانا۔"

یہ الفاظ اتنے سادہ تھے کہ زبان سے نکلتے ہی دل کو گھائل کر گئے، چونکہ بنگلہ زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا، اس لئے کسی ترجمان کی ضرورت نہ پڑی، محبت ترجمان سے بے نیاز ہوتی ہے۔ بچی دروازے پر کھڑی حسرت بھری نظروں سے مجھے جاتے ہوئے دُور تک دیکھتی رہی اور میں نے بھی کئی بار مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت تھی اسے کیونکر بیان کروں۔

یہ مفروضہ — مشرقی پاکستان علیحدہ ہونا چاہتا ہے — بحث سے خارج کر دینے کے بعد ہمیں اصل مسائل کا سراغ لگانے کی فکر کرنی چاہیئے۔ اس کام کے لئے ایک راستہ تو یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ تمام محبِ وطن سیاسی جماعتوں اور اربابِ نظر کی گول میز کانفرنس بلائی جائے۔ یہ گول میز کانفرنس حقائق اور مسائل کو صحیح پس منظر کے ساتھ دیکھنے میں مدد دے گی۔ اگر اس کانفرنس میں طول طویل تقریروں کے بجائے ہر سیاسی جماعت

مسائل کے واضح اور ٹھوس حل پیش کرے، تو گفتگو بہت مفید ہو سکتی ہے، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری سیاسی زندگی میں جو غلط قسم کی انا پیدا ہو گئی ہے، وہ کانفرنس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی۔

دوسرا قابلِ عمل اور نتیجہ خیز طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے ریٹائرڈ ججوں اور انتظامی، سیاسی، عمرانی اور نفسیاتی امور کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیشن قائم کرے۔ اس کمیشن میں ایسے افراد لئے جائیں جن کا عوام دل سے احترام کرتے ہیں، اس کمیشن کا طریقِ کار اسی انداز کا ہو جیسا دستوری کمیشن کا تھا، یعنی وہ دانشوروں سے بھی ملے اور حقیقی عوامی نمایندوں سے بھی۔ دستوری کمیشن نے ایک مرحلے پر مشرقی پاکستان کی شکایات کا جائزہ لینے کا ارادہ بھی کیا تھا، لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر وہ ایسا نہ کرسکا۔

کمیشن کو تمام اہم مسائل کے مختلف گوشے تفصیلی اور تنقیدی نظر سے دیکھنے چاہییں اور وہ وہاں کی نفسیاتی فضا کا خیال رکھتے ہوئے ایک مربوط و مبسوط رپورٹ پیش کرے۔ مجھے یقین ہے یہ رپورٹ ایک اہم اور تاریخی دستاویز ثابت ہوگی۔ (میں کمیشن کے ارکان کی فہرست بھی دے سکتا تھا، لیکن ڈرتا ہوں کہ حدود پھاندنے کا الزام نہ آجائے)

کمیشن کی تجویز پیش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے طور پر مسائل کا جائزہ لینا چھوڑ دیں۔ مختلف حلقوں میں کام کرنے کے بعد جو پہلو واضح ہوئے، وہ آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ ترتیب یہ ہے کہ کم اہم مسائل سے بتدریج زیادہ اہم مسائل کی طرف بڑھا جائے۔

غربت مشرقی پاکستان کا عام مسئلہ ہے۔ اس بحث میں الجھنا سودمند نہیں کہ یہاں تو غربت ایک صدی سے چلی آتی ہے۔ اگر صدیوں سے چلی آتی ہے، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اسے دُور کرنے کی کوشش نہ کی جائے، سوال یہ ہے کہ غربت دُور کیسے کی جائے؟

اس سوال کا فنی جواب ماہرینِ معاشیات ہی دے سکتے ہیں، لیکن موٹی موٹی باتیں کہنے کا، ایک شہری کی حیثیت سے، میں بھی حق رکھتا ہوں۔ میرے نزدیک غربت کے چار بڑے اسباب یہ ہیں:

(۱) معیشت کا کمزور بنیادی ڈھانچہ۔

(۲) سیلابوں اور بحری طوفانوں کی کثرت۔

(۳) مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان میں سرمائے کا انتقال۔

(۴) دولت کی غیر منصفانہ تقسیم۔

ان چاروں اسباب کا مختصر سا جائزہ یہ ہے۔

بنیادی ڈھانچہ

مشرقی پاکستان کا اقتصادی بنیادی ڈھانچہ چند تاریخی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر کمزور رہا ہے۔ بنیادی ڈھانچے (INFRA STRUCTURE) سے مراد بنیادی سہولتیں ہیں جو معاشی اور اقتصادی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں ذرائع آمد و رفت آبی اور برقی وسائل، زمین اور معدنیات، خام مال اور ہنرمند فردی قوت وغیرہ شامل ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ بنیادی ڈھانچے کو مستحکم کرنے کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتیں زر کثیر خرچ کر رہی ہیں۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے مطابق ۸۰۰۰، اکروڑ روپے پبلک سیکٹر میں خرچ کئے جائیں گے۔ اس رقم کا بڑا حصّہ بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے پر صرف ہوگا۔

سیلاب اور طوفان

سیلاب اور بحری طوفان مشرقی پاکستان کی معیشت کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی ۶۵ فی صد آمدنی زراعت سے حاصل ہوتی ہے۔ آئے دن کے سیلابوں میں فصلیں کیا خاک ہوں گی؟ معیشت کے بنیادی ڈھانچے کو مستحکم کرنے کے لئے سال بھر میں جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ بڑی حد تک سیلاب کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان طوفانوں نے ہموار اور مضبوط معاشرتی زندگی کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں جس کے بُرے اثرات ذہنی ساخت اور کردار کی تشکیل میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جس معاشرے کا بڑا حصّہ ہر سال غیر یقینی حالات کا شکار ہو۔ اس میں یقین اور اعتماد اور صحت مند اندازِ فکر مشکل ہی سے

پیدا ہوسکے گا۔ سیلابوں پر قابو پانے کے لیئے حکومت نے کمیشن بھی مقرر کیا اور اس کمیشن نے سفارشات بھی پیش کیں۔ لیکن طوفانوں پر آج تک قابو نہ پایا جا سکا۔ دراصل مشرقی پاکستان میں دریاؤں پر قابو پانا کچھ اتنا آسان نہیں۔ اَب تک ہمارے سامنے دو بڑی تجویزیں آئی ہیں۔ مشینوں کے ذریعے دریاؤں کی کھدائی کی جائے تاکہ زیادہ پانی سنبھال سکیں۔ اس تجویز میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ سمندر جیسے وسیع دریاؤں کی کھُدائی ممکن نہیں، اور اگر کھدائی کر بھی دی جائے۔ تو ریت نکال کر کہاں پھینکی جائے۔ وہاں زمین اتنی فالتو نہیں کہ دریا کے کناروں سے ایک دو میل دُور ریت ڈالی جا سکے۔ اگر اسے کناروں کے ساتھ ساتھ جمع کرتے ہیں، تو سیلاب کا ایک ہی ریلا اس ریت کو دریا کے اندر بچھا دے گا۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ دریاؤں کے دونوں کناروں پر بند باندھ دیئے جائیں۔ اس تجویز کا ضرر رساں پہلو یہ ہے کہ اگر صرف بڑے بڑے ہی دریاؤں پر بند تعمیر کئے جائیں، تو ہزاروں میل لمبے علاقے میں بند تعمیر کرنے پڑیں گے۔ ظاہر ہے یہ کام ایک دو سال میں مکمل نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے، بند تعمیر کرنے کا کام اوپر سے شروع ہُوا، اگلے سال سیلاب آگیا، وہ علاقہ تو محفوظ ہو جائے گا، جہاں بند تعمیر ہو چکے ہیں، لیکن زیریں علاقے میں سیلاب کی تباہ کاریاں قیامت خیز ہوں گی۔ ظاہر بات ہے یہ صورتِ حال زیریں علاقے کو کبھی گوارا نہ ہو گی۔

آپ مجھ سے پوچھیں گے، پھر اس کا حل کیا ہے۔ اس کا صحیح جواب انجینیر ہی دے سکتے ہیں۔ میں تو چند معمولی اشارے کروں گا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہالینڈ اِسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ وہاں خشکی کی سطح، سمندر کی سطح سے نیچی ہے، پانی ملک کے اندرونی حصے میں سینکڑوں میلوں میں پھیل جاتا تھا۔ ہالینڈ میں بسنے والوں نے سمندر سے طاقت آزمائی کا فیصلہ کر لیا اور برسوں کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں کے بعد سمندر کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے، وہ علاقہ جو ہمیشہ پانی میں رہتا تھا، اب اس پر شاندار کارخانے سر اٹھائے سمندر کا منہ چڑا رہے ہیں۔

چین کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں کا ایک سرکش دریا ہر سال زندگیوں کا نذرانہ قبول کرتا تھا۔ لیکن اب وہی دریا اس خاموشی اور ادب سے چلتا ہے، جس طرح ایک فرمانبردار خاوند اپنی بیگم کے پیچھے۔

ہمارے انجینیروں کو معلوم کرنا چاہیے کہ ان دونوں قوموں کو کیونکر کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں مغربی پاکستان کے انجینیر اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انہیں مغربی پاکستان میں سیلابوں پر قابو پانے کا پہلے ہی سے خاصا تجربہ ہے ـــــ اربابِ حکومت، انجینیروں اور عوام کے تعاون سے طوفانوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ عوام کا تعاون کیسے حاصل کیا جائے اور ان میں وہ عزم اور جوش و خروش کیسے پھونکا جائے جو سمندروں کا منہ پھیر دے، اس کا جواب سب سے آخر میں عرض کروں گا۔

انتقالِ زر

اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشرقی پاکستان کا سرمایہ مغربی پاکستان منتقل ہوتا رہا ہے اس کو روکنے کا فطری طریقہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں سرمایہ لگانے کے لئے کشش پیدا کی جائے اس سلسلے میں اِن چند تجاویز پر غور کیجئے:

(۱) مشرقی پاکستان کے لئے بنکوں کے قرضے کم شرح سُود پر جاری کئے جائیں۔ اس رعایت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے سرمایہ کار مشرقی پاکستان میں خوشی خوشی سرمایہ لگائیں گے۔ اس طرح مغربی پاکستان سے سرمایہ ازخود مشرقی پاکستان منتقل ہوجائے گا۔

(۲) صنعت کاروں کو کم ازکم ۱۹۷۵ء تک انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

(۳) مشرقی پاکستان میں درآمد ہونے والی مشینری پر کسٹم ڈیوٹی کم لگائی جائے، تاکہ زراعت اور صنعت میں زیادہ سے زیادہ نجی سرمایہ کھنچ کر آئے۔

مشرقی پاکستان میں رہنے والوں کو آسان شرائط پر قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ چھوٹی بڑی صنعتیں قائم کرسکیں۔ ظاہر ہے وہ جو منافع کمائیں گے، مشرقی پاکستان ہی میں رہے گا۔

(۵) ہر نئی فرم اور کمپنی کے لئے یہ لازم قرار پائے کہ اس کے حصے داروں میں مشرقی پاکستان کے لوگ بھی ہوں۔ اس طرح اس فرم کو جو منافع ہوگا، اس کا ایک حصہ یقینی طور پر مشرقی پاکستان میں رہے گا۔

(۶) مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کو بذریعۂ قانون اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ مزدوروں کو اپنے منافع میں شریک کریں۔ مزدوروں کو منافع میں شریک کرنے سے جہاں اور کئی خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے، وہاں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان کے منافع اور بچتیں بڑی حد تک مشرقی پاکستان میں رہیں گی اور تشکیلِ زر کا عمل تیزی سے شروع ہو جائے گا۔

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم

دولت معاشرے میں انصاف کی بنیادوں پر تقسیم نہ ہو، تو پیسہ ہوتے ہوئے بھی عوام غریب رہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی صورتِ حال کچھ اسی قسم کی ہے، وہاں دولت کے منبع پٹ سن کے کھیت ہیں، لیکن سب سے زیادہ نادار پٹ سن کا کاشتکار ہے۔ اس غربت کو جنم دینے میں مغربی پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ کاشت کار اور پٹ سن برآمد کرنے والوں کے درمیان تقریباً پانچ واسطے ہیں۔ فرض کیجئے اگر ایک گانٹھ ۱۰۰ روپے میں برآمد ہوئی ہے، تو کاشت کار کے حصے میں صرف سات یا آٹھ روپے آئیں گے۔

صنعتی میدان میں صورتِ حال اس سے مختلف نہیں۔ میں نے پٹ سن کے کئی کارخانے دیکھے۔ ان کارخانوں کے مالکان اس قدر منافع خور ہیں کہ ہر دو تین برس کے بعد ایک نیا کاروبار شروع کر دیتے ہیں، مگر وہ لوگ جن کا خون پٹ سن کی گانٹھیں تیار کرتا ہے۔ ہفتے میں زیادہ سے زیادہ اٹھارہ روپے کماتے ہیں۔ (یہ سب سے بڑی مزدوری ہے، ورنہ ہفتے میں صرف آٹھ روپے دینے والے بھی موجود ہیں)

پھر یہ اکثر سرمایہ دار زکوٰۃ مشرقی پاکستان میں نہیں دیتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ان کے ہیڈ آفس جو اکثر کراچی میں ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اگر مشرقی پاکستان میں لگے ہوئے سرمائے کی زکوٰۃ مشرقی پاکستان ہی میں نکال دی جائے، تو دولت کی گردش رکے گی نہیں اور ایک غریب آدمی بھی اس سے بہرہ ور ہو سکے گا۔

یہ ہے میرے نزدیک پہلے مسئلے کا حل۔

دوسرا مسئلہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی جغرافیائی دُوری کا ہے۔ ایک طبقہ اس جغرافیائی دوری میں دونوں خطوں کی زمین، آب وہوا اور طرزِ معیشت کا فرق بھی شامل کر دیتا ہے۔ اس فاصلے کو اتنی اہمیت دی گئی کہ بعض اوقات یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ پاکستان کی دو بازوؤں میں تشکیل ایک غیر فطری اور غیر معیشی عمل تھا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا رہا کہ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کا وجود دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ اس اہم مسئلے کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ سطحی اور بعض اوقات غلط اقدامات کی وجہ سے اصل معاملہ جوں کا توں رہا، بلکہ اور بھی خراب ہو گیا۔ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ دُنیا میں اور بھی ممالک ہیں جن کے علاقے جغرافیائی وحدت کے بغیر دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ امریکہ کی دو ریاستیں ـــــ الاسکا اور ہوائی ـــــ باقی ۴۸ ریاستوں سے بڑے فاصلے پر ہیں۔ الاسکا، جو امریکہ کی سب سے بڑی ریاست ہے اور جس کا رقبہ ۵۸۶۴۰۰ مربع میل (پاکستان کے رقبے سے تقریباً ڈیڑھ گنا) ہے، وہ امریکہ سے ایک ہزار میل دُور ہے۔ امریکہ اور الاسکا کے درمیان کینیڈا پڑتا ہے۔ ہوائی کا رقبہ ۶۴۲۳ مربع میل ہے اور وہ سان فرانسسکو سے ۲۱۰۰ میل دُور سمندر میں واقع ہے۔ انڈونیشیا ریاست بے شمار جزیروں پر مشتمل ہے اور ان کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے۔ چھوٹے اور بڑے جزیرے تقریباً تین ہزار میل میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے چاروں طرف ملک ہی ملک نظر آتے ہیں جن میں انڈونیشیا کے دشمن ممالک بھی شامل ہیں۔ وہ ریاست جو برطانیہ عظمیٰ کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس کے تمام علاقے جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملحق نہیں تو کیا اس جغرافیائی دُوری کی وجہ سے ان ملکوں کی معیشت کمزور پڑ گئی، یا ان کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہو گئی؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دَور میں فاصلے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ انگریز چھ ہزار میل دُور بیٹھ کر پورے ہندوستان کا نظم چلا سکتا تھا جبکہ اسے قدم قدم پر مزاحمت اور نفرت کے الاؤ عبور کرنے پڑے۔ اور ہم ہیں کہ محبت اور خلوص اور باہمی مشورے سے ایک ہزار میل کی دُوری سے پیدا ہونے والے اپنے ہی مسائل حل نہیں کر سکتے؟ عجب ستم ظریفی ہے!

سیدھی سی بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان صرف ایک کھلے سمندر کے ذریعے ایک

دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سمندر کے ایک حصّے پر بھارت یعنی ہمارے دشمن ملک کا قبضہ ہے۔ تاہم سمندر اتنا وسیع ہے کہ ہم دشمن کے علاقے سے دُور رہ کر بھی مشرقی پاکستان پہنچ سکتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہماری کوششوں کا رُخ سمندر کی طرف ہونا چاہیئے۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے مابین جغرافیائی فاصلے پر قابو پانے اور بھارت کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ ہے سمندر پر حکمرانی —— آپ کو یاد ہوگا کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں انگلستان اسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ سپین، فرانس اور جرمنی اس کے زبردست دشمن تھے۔ اگر اس وقت انگلستان کے منچلے جہازران سمندر پر اپنی حکومت قائم نہ کرتے، تو انگلستان کی تاریخ یقیناً کچھ اور ہوتی۔ آج ہمارے سامنے بھی اِسی قسم کا چیلنج ہے۔ بھارت ہماری آزادی کے درپے ہے۔ دونوں بازوؤں کی آزادی کا تحفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہمیں سمندر پر پورا کنٹرول حاصل ہو۔

میں سمجھتا ہوں ہمیں ایک حقیقت پسندانہ منصوبے کے تحت جہازرانی پر خاص توجہ دینی چاہیئے۔ یہ جہاز دونو ں بازوؤں میں ایک پُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پُل کی تعمیر اور استحکام ہماری قومی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں تجاویز پیش کرنے سے پہلے موجودہ انتظامات کی ایک جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔ بنیادی حقائق یہ ہیں۔

نام جہاز		مسافروں کی تعداد	مال کی گنجائش	کب تیار ہوا	رفتار	وقت
شمس	عرشہ	۱۰۴۸	۳½ ہزار ٹن	۱۹۶۱ء	۱۷ ناٹ	۷ دن
	اعلیٰ درجہ	۱۰۰				
		۱۱۴۸				
سفینۂ عرب	عرشہ	۱۱۶۸	۳ ہزار ٹن	۱۹۶۲ء	۱۵ ناٹ	۸ دن
	اعلیٰ درجہ	۱۲۶				
		۱۲۹۴				

نام جہاز		مسافروں کی تعداد	مال کی گنجائش	کب تیار ہُوا	وقت
رستم	عرشہ	۲۵۰	۶½ ہزار ٹن	۱۹۶۳ء	یہ جہاز ایک برس بیکار کھڑا رہا، کیونکہ یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ یہ مال بردار ہو یا مسافر [بردار]
	اعلیٰ درجہ	۲۸			
		۲۷۸			
اوشن انرجی	عرشہ	۲۵۰	۶½ ہزار ٹن	۱۹۶۴ء	یہ تیرہ دنوں میں پہنچتا ہے۔
	اعلیٰ درجہ	۲۸			
		۲۷۸			

کراچی سے چٹاگانگ کا فاصلہ ۲۶۴۵ میل ہے۔ مال برداری کا کرایہ ۱۹۶۰ء سے پہلے ۱۱۶/- روپے فی ٹن، پھر ۱۱۵/- روپے ٹن اور ۱۹۶۳ء سے ۱۴۴/- روپے ٹن ہے۔ چٹاگانگ سے واپسی پر ۳۰۱/- روپے ٹن ہے، کیونکہ مال کم ملتا ہے اور مقابلہ زیادہ ہے۔ عرشے کے مسافر خوراک سمیت ۱۹۶/- روپے ادا کرتے ہیں۔ کراچی اور چٹاگانگ کے درمیان عموماً صرف ۸۰ فیصد سیٹیں پُر ہوتی ہیں۔

اگر آپ اجازت دیں، تو اصل حالات کے پیچھے چُھپے ہُوئے واقعات ذرا تفصیل سے بیان کر دوں۔ اس تصویر سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو مسئلہ اہم ترین مسائل میں نمبر ۲ پر آتا ہے، اس پر کس قدر توجہ دی جا رہی ہے۔ آپ کو یہ بات سُن کر حیرت ہوگی کہ ۱۹۶۱ء تک مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان صرف ایک جہاز چلا کرتا تھا۔ ان دنوں حالت یہ تھی کہ جہاز ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں کے بعد چٹاگانگ پہنچتا۔ اس کے بعد تین اور جہازوں کا اضافہ ہُوا۔ جہاز رانی کے ماہرین جانتے ہیں کہ یہ جہاز پرانے ہیں، اسی لئے ان کی رفتار کم ہے۔ منصوبہ بندی کا یہ عالم ہے کہ ایک جہاز پورے ایک سال تک بے کار کھڑا رہا، کیونکہ اس کے بارے میں یہ فیصلہ نہ ہوسکا تھا کہ اسے مسافر اُٹھانے ہیں یا مال۔ خبر نہیں ان جہازوں کی آمد و رفت کے اوقات کیسے ہیں کہ ستمبر ۱۹۶۶ء کا اردو ڈائجسٹ

بحری جہاز کے ذریعے چٹاگانگ ۶۔ اکتوبر کو پہنچا۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیان جہاز رانی کے معاملے میں تعاون کے بجائے عدمِ تعاون پایا جاتا ہے جہازوں سے اُترنے والا سامان مہینوں چٹاگانگ کی بندرگاہ پر پڑا رہتا ہے (غالباً ویگن دیر سے مہیا ہوتے ہیں) اس کے نتیجے میں سامان پر ڈیمرج پڑتا رہتا ہے اور اس کی قیمتیں اسی نسبت سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اس سے عوام میں بے چینی پیدا ہوتی ہے اور اس کا سارا الزام مرکزی حکومت پر تھوپ دیا جاتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ مشرقی پاکستان میں سیمنٹ، شکر اور نمک کی بہت کمی ہے اور وہاں ان کی قیمتیں قدرتی طور پر مغربی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ ان اشیاء کو مشرقی پاکستان بھیجنے کی عام اجازت ہو، تاکہ بڑی تعداد میں کاروباری حضرات اس میدان میں آئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مقابلہ ہو اور قیمتیں ایک خاص سطح سے آگے نہ بڑھنے پائیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ سیاسی بنیادوں پر مختلف افراد کو اجازت نامے دیئے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ اجازت نامے حاصل کرنے والے زیادہ تر افراد غیر کاروباری ہوتے ہیں، اسی لئے وہ یا تو یہ اجازت نامے کاروباری لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں یا خود کاروبار سنبھالتے ہیں، لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے ٹھیک طور پر سرانجام نہیں دے سکتے۔ نتیجہ یہ کہ قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔

مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان جانے والی چیزوں پر اکسائز ڈیوٹی لگتی ہے، پھر ۱۹۶۰ء تک ان پر ۱۱۶/- روپے فی ٹن کے حساب سے کرایہ وصول کیا جاتا تھا۔ مجھے بتایا گیا یہ تقریباً اتنا ہی تھا جتنا پاکستان سے انگلستان تک کا ــــ (اب مقابلے کی وجہ سے کرایہ ۴۹/- روپے تک آگیا ہے) سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ عوام کو جہازوں کے اوقات اور ان کے کرایوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ وہ اسی قدر جانتے ہیں کہ مشرقی پاکستان صرف ہوائی جہاز کے ذریعے ہی جایا جا سکتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ جہاز رانی جس کے ذریعے ہم مشرقی پاکستان کے پانچ اہم مسائل حل کر سکتے ہیں، اس کی اہمیت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا۔ اگر جہاز رانی کا نظام معیاری ہو، تو اس کے ذریعے جغرافیائی بُعد پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی معیشت کو استحکام حاصل ہوتا ہے، وہاں کا بیروزگاری کا مسئلہ بڑی

حد تک کم ہو سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا بحری دفاع مضبوط ہوتا ہے۔ اس قدر اہم معاملے کو باقی تمام معاملات پر ترجیح ملنی چاہیئے تھی اور حکومت کا فرض تھا کہ وہ یہ معاملہ قومی بنیادوں پر ہنگامی حالات کی سی تیزی کے ساتھ حل کرتی۔

کسی اور ملک کے لئے جہاز رانی کاروبار سے زیادہ کی اہمیت نہ رکھتی ہو، لیکن پاکستان کے لئے اس کی حیثیت جداگانہ ہے۔ اگر ایک جہاز آسٹریلیا دیر سے پہنچتا ہے، تو ہو سکتا ہے وہاں کی تجارت تھوڑی سی متاثر ہو جائے، لیکن مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان جہازوں میں تاخیر کا مطلب پورے پاکستان کی معیشت اور سیاست کو درہم برہم کئے رکھنا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں جہاز رانی پر بطور خاص تحقیق ہونی چاہیئے۔ ایسے تحقیقاتی ادارے قائم کئے جائیں جن کو چلانے والے ملک کے اچھے دماغ ہوں۔ مشاہرے معقول دیے جائیں۔ یہ دماغ اس بات کا جائزہ لیں کہ دنیا میں سب سے تیز رفتار جہاز کن کن ملکوں کے پاس ہیں اور پھر دیکھا جائے کہ وہ جہاز ہمارے مخصوص حالات میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ ذہین طلبہ ان ملکوں میں بھیجے جائیں اور وہ قومی جذبے کے ساتھ جہاز رانی کی صنعت میں مہارت حاصل کریں۔ سخت ریاضت کے ذریعے انہیں اس کام میں اتنی مہارت اور اہلیت حاصل ہو جائے کہ وہ بین الاقوامی مقام حاصل کر لیں۔ ایسی شہرت حاصل کرنے کے بعد جب وہ کسی بیرونی فرم کو پاکستان کی ضروریات کے مطابق جہاز بنانے کا آرڈر دیں گے، تو وہ فرم یقیناً اس آرڈر کے عین مطابق جہاز تیار کرے گی۔ اس ادارے کو مسلسل تحقیق میں مصروف رہنا چاہیئے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے وسائل میں برکت دیں، تو ہم بحری جہازوں کا کارخانہ بھی قائم کر سکتے ہیں۔

ہمارا منصوبہ یہ ہونا چاہیئے کہ آئندہ تین چار برس میں ہمارے پاس اتنے بحری جہاز ہو جائیں کہ ہفتے میں دو جہاز کراچی اور چٹاگانگ کے درمیان چلنے لگیں۔ یہ کام کثیر زرِ مبادلہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ہم اس کام کی اہمیت کے قائل ہو گئے، تو پھر زرِ مبادلہ کا انتظام ہو ہی جائے گا۔

ہمیں اتنے جدید جہاز حاصل کرنے چاہئیں کہ تین ہزار میل کا فاصلہ تین چار دنوں میں طے ہو سکے اور

اس قدر تیز رفتار جہاز اسی وقت تیار ہو سکیں گے، جب ہم خود جہاز رانی کی ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کر لیں گے۔ ہمارے مخصوص حالات میں جہازوں کی رفتار بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اور زندہ قوم اپنا مسئلہ حل کرنے کے لئے خود آگے بڑھا کرتی ہے۔

اِن اقدامات کے علاوہ مرکزی حکومت کو مزید قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ حالات تقاضا کرتے ہیں کہ جہازوں کے کرائے میں اور کمی ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ مسافروں کو بحری جہاز کے ذریعے سفر کرنے کی ترغیب دی جا سکے اور دوسرے جو چیزیں مغربی پاکستان سے بھیجی جائیں، ان کی قیمتیں کرائے کی وجہ سے زیادہ اُونچی نہ ہو جائیں۔ بحری تجارتی کمپنیاں کرائے کم کرنے پر تیار نہ ہوں گی۔ مرکزی حکومت کو ایک عرصے تک انہیں مالی امداد دینی پڑے گی۔ میں سمجھتا ہوں عظیم مقاصد کے پیشِ نظر مرکزی حکومت کو یہ خسارہ برداشت کر لینا چاہیئے۔ ساتھ ہی ساتھ مشرقی پاکستان جانے والی اشیاء پر ایکسائز ڈیوٹی ختم کر دی جائے مشرقی پاکستان جانے والی اشیاء کے لئے اجازت نامے دینے کے بجائے صنعت کاروں اور کاروباری حضرات کو عام اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ چند اصول پیشِ نظر رکھتے ہوئے چیزیں براہِ راست بھیجیں اور مشرقی پاکستان میں ان کی تقسیم کا ایسا انتظام کریں کہ قیمتیں ایک خاص سطح سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔

اِن اقدامات سے مشرقی پاکستان کی معیشت، معاشرت اور سیاست میں چند برسوں کے اندر اندر عظیم انقلاب رونما ہو گا۔

اب میں ایک ایسے مسئلے کی طرف آتا ہوں، جس پر عموماً گفتگو نہیں ہوتی، لیکن مشرقی پاکستان کے حالات بگاڑنے میں اس کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔ میری مراد ہندو اقلیت سے ہے۔ اس اقلیت نے پچھلے اٹھارہ اُنیس برسوں میں وہاں کی سیاست، معیشت اور معاشرت میں جو زہر گھولا ہے، اس کے خاموش اثرات انتہائی بھیانک ہیں۔ جی چاہتا ہے اس شرمناک ڈرامے کی تمام جزئیات تفصیل سے قلمبند کروں، لیکن ان صفحات میں گنجائش نہیں۔ صرف چند اہم واقعات کی طرف اشارے کرتا ہوں:

مرحوم آغا خاں، جن کی آنکھوں نے برصغیر پاک و ہند کی سیاست کے تمام پیچ و خم دیکھے ہیں، بلکہ یوں کہیے

کہ ان میں بلاواسطہ یا بالواسطہ حصّہ لیا ہے اور جن کا شمار دنیا کے مدبّرین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ غلام محمد مرحوم (اس وقت کے گورنر جنرل)، کے نام ایک اہم دوستانہ خط لکھا جس میں تحریر تھا، کہ مجھے مشرقی پاکستان کی اقلیت کی سرگرمیوں پر گہری تشویش ہے۔ میں نے اقلیّت کے ہاتھوں آسٹریا اور ہنگری کی سلطنتیں تباہ ہوتے دیکھیں اور تاریخ میں اَن گنت عظمتیں اقلیتوں کی سازشوں سے دفن ہوگئیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ہندو اقلیت وہی رول مشرقی پاکستان میں ادا کرنا چاہتی ہے۔ مجھے جو اطلاعات ملی ہیں، وہ سخت پریشان کن اور اضطراب انگیز ہیں۔ تم اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لو۔

(مجھ سے اس خط کا ذکر جناب اے۔ ٹی۔ ایم مصطفیٰ[1] مرحوم نے کیا تھا)

۱۹۵۴ء کے انتخابات میں ہندو اقلیت کو حسرتیں نکالنے کا موقع مل گیا۔ مسلم لیگ کی شکست کے بعد صوبے کا سیاسی توازن کانگریس کے ہاتھ میں آگیا اور اس توازن کی بدولت اس نے مرکزی پارلیمنٹ میں بھی اپنا دائرۂ اثر بڑھانا شروع کر دیا۔ عوامی لیگ اور کرشک سرمک کی کشمکش جوں جوں شدت اختیار کرتی چلی گئی ہندو اقلیت کے پنجے جسدِ سیاست میں گہرے اُترتے چلے گئے، اب کوئی سیاسی جماعت ہندو اقلیت کے تعاون کے بغیر برسرِاقتدار نہیں آسکتی تھی اور جو برسرِ اقتدار آتی، وہ اقلیت کی ملک دشمن سرگرمیاں برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس ہندو اقلیّت نے بڑے پیمانے پر سمگلنگ کا کام شروع کر دیا۔ کروڑوں روپے کا زرِمبادلہ ناجائز طریقوں سے بھارت جاتا رہا۔ ریاست اور فوج کے اہم راز سرحد کے اس پار پہنچتے رہے اور جب اس کی سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں، تو ایک وزیرِاعلیٰ نے سخت اقدامات کئے۔ ان سخت اقدامات کے بعد اس پر کیا گزری، اس کی روداد دستوری کمیشن کی رپورٹ میں پڑھیئے:

۱۹۵۷ء میں مشرقی پاکستان کے وزیرِاعلیٰ نے فوج سے مدد طلب کی کہ پاکستان سے ہونے والی سمگلنگ کی مؤثر روک تھام کے لئے سکیم بنائی اور چلائی جائے۔ سکیم نہایت کامیاب رہی اور صرف ایک مہینے میں کروڑوں روپے کی مالیت کا سامان پکڑا گیا، لیکن وزارت جس ہندو اقلیت کے سہارے کھڑی تھی، اس کے ایک طبقے نے وزیرِاعلیٰ پر دباؤ ڈالا اور وہ سکیم عملی طور پر ختم ہوگئی۔ اسی دباؤ کی وجہ سے ان مجرموں کے خلاف مقدمات

واپس لے لیے گئے جن پر الزام تھا کہ انہوں نے مشرقی پاکستان میں فوجی سرگرمیوں کی اطلاعات پڑوسی ملک کو پہنچائی ہیں۔

یہ تھا وہ خفیہ ہاتھ جس کی طرف آغا خاں نے ۱۹۵۲ء میں واضح طور پر اشارہ کیا تھا۔

۱۹۵۶ء میں سہروردی صاحب کے برسر اقتدار آتے ہی مخلوط انتخاب کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس طوفان میں ہندو اقلیت کے ایک مؤثر عنصر نے جو شر انگیز کردار ادا کیا، وہ تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ ڈھاکے میں پارلیمنٹ کا اجلاس تھا۔ مشرقی پاکستان کی کانگریس نے غنڈوں کے ذریعے خوف و ہراس کی ایسی فضا پیدا کر دی جس میں جداگانہ انتخاب کے حق میں کچھ کہنا نہایت مشکل تھا۔ پارلیمنٹ ہاؤس کی گیلریوں میں باثر ہندو بیٹھے تھے اور ان کے تیور ان کے مذموم عزائم کی غمازی کر رہے تھے۔

پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کی ڈور عملی طور پر کانگریس کے ہاتھ میں تھی۔ سہروردی صاحب کے ٹینٹوے پر خفیہ ہاتھ نے انگوٹھا رکھا ہوا تھا، انہیں خدشہ تھا کہ اگر مخلوط انتخاب کے فیصلے میں ذرا سی تاخیر ہوئی، تو ان کی وزارت چھن جائے گی، چنانچہ ایک ایسا مسئلہ جس پر ملک میں پانچ چھ برس سے گرم گرم بحثیں ہو رہی تھیں، اس کا فیصلہ ایک دو گھنٹہ میں ہو گیا۔ پارلیمنٹ کا معروف طریقہ یہ ہے کہ ہر اہم مسئلے کے لئے کم از کم دو دن کا نوٹس دیا جاتا ہے تاکہ قوم کے نمایندے اس مسئلے پر سوچی سمجھی رائے کا اظہار کر سکیں، مگر اس اجلاس میں یہ ہُوا کہ دوسرے امور پر بحث ہو رہی تھی کہ اچانک التوا کا اعلان کر کے مخلوط انتخاب کا بل پیش کر دیا گیا۔ زیادہ تر ہندو نمایندوں نے اس کے حق میں تقریریں کیں۔ اس پر ایک مسلمان نمایندے نے کہا، تم نے قیام پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ تمہارے اہل و عیال بھارت میں رہتے ہیں، ہمیں تمہاری وفاداری پر کیسے یقین آئے۔ اس پر ایک ہندو رکن بسنتا کمر داس نے جو جواب دیا، وہ اسی کے الفاظ میں سنیے:

ہمارے ذہین نوجوان جو یونیورسٹی سے تعلیم پا کر نکلتے ہیں مشرقی بنگال میں ان کے لئے کیریر بنانے کا کوئی میدان نہیں۔ انہیں یہاں سرے سے کوئی روزگار ہی نہیں ملتا۔ کیا وہ یہاں اس لئے رہیں کہ گلیوں میں مارے مارے پھریں اور انہیں کمیونسٹ ہونے کے الزام میں جیل بھیج دیا جائے؟ قدرتی طور پر وہ دوسری جگہ چلے جاتے

ہیں اور ہر شہری کو اس کا حق پہنچتا ہے، اگر اسے روزگار کے حصول میں ایسا کرنا پڑے۔"

دیکھی آپ نے دیدہ دلیری؟ ان ذہین نوجوانوں کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر پاکستان کے وظائف پر باہر جاتے اور تعلیم حاصل کر کے بھارت میں ملازمت اختیار کر لیتے اور وہیں کے شہری بن جاتے ہیں۔

دستوری کمیشن کے سامنے ایسی شہادتیں پیش ہوئیں، جنہوں نے بتایا کہ وہ ہندو جن کے اہل و عیال بھارت میں رہتے ہیں، بھارت کے حلقۂ اثر میں ہیں اور انہوں نے مخلوط انتخاب کا مطالبہ اس لیے کیا تاکہ انتخابات میں پاکستان کی آئیڈیالوجی کے خلاف کام کر سکیں۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد بعض ہندو افسروں کا رویّہ بہت ہی عجیب و غریب ہو گیا تھا۔ جب حکومت نے اُن لوگوں کے خلاف سخت اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا جو انکم ٹیکس اور زرِ مبادلہ کی پابندیوں سے گریز کرتے تھے، تو ڈھاکہ ہائی کورٹ کے ایک ہندو جج چھٹیوں میں مغربی بنگال گئے اور پھر واپس نہ آئے، بعد میں مستعفی ہو گئے۔ ایک ہندو سی ایس۔ پی کا تبادلہ مغربی پاکستان کیا گیا، تو وہ ملک ہی چھوڑ گیا اور ہندوستان جا بسا۔

ہندوؤں کا ایک بارسوخ طبقہ اب بھی وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ ان علاقوں میں جہاں دریا کا ایک کنارہ مشرقی پاکستان میں ہے اور دوسرے کنارے بھارت کی سرزمین ہے، ان دونوں کناروں پر ہندوؤں کے بڑے بڑے گودام ہیں۔ مشرقی پاکستان کا چاول، پٹ سن، لوہے کی سلاخیں راتوں رات اُس طرف پہنچ جاتی ہیں۔ سمگلنگ کا زیادہ تر کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور ان کی سرپرستی وہ پاکستانی کرتے ہیں، جنہیں ملک کے مقابلے میں دولت زیادہ عزیز ہے۔

سمگلنگ کا مشرقی پاکستان کی معیشت پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ جنگ کے دنوں میں جب سمگلنگ بالکل بند تھی، مغربی بنگال میں چاول کے نرخ ستّر روپے من تک پہنچ گئے تھے اور مشرقی پاکستان میں ۲۵ روپے من سے آگے نہ بڑھے۔ پانچ چھ ماہ بعد جونہی سمگلنگ کا کاروبار دوبارہ چمکا، مشرقی پاکستان میں چاول کے نرخ ساٹھ تک پہنچ گئے اور اُدھر گر کر ۴۰ ہو گئے۔ اس کاروبار کے ہوتے ہوئے مشرقی پاکستان کی معیشت کیسے پنپ سکتی ہے؟ اس کے علاوہ بھارت جو پٹ سن برآمد کرتا ہے، اس میں بڑی مقدار پاکستانی پٹ سن کی

ہوتی ہے، ورنہ وہ پٹ سن کی بین الاقوامی مارکیٹ میں پاکستان کا ہرگز مقابلہ نہ کرسکتا۔

مجھے بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں بڑے بڑے کارخانے ۲۵ کے قریب ہیں۔ ان میں سے ۸ کے مالک ہندو ہیں۔ جن کارخانوں کے مالک مسلمان ہیں، ان میں ہندو مزدوروں کی تعداد خاصی ہے، بلکہ بعض کارخانوں میں انتظامی عہدوں پر ہندو فائز ہیں۔ مشرقی پاکستان کا اگر اس نقطۂ نظر سے سروے کیا جائے، تو بہت سے حیران کُن حقائق سامنے آئیں گے۔

اب سیاست میں ہندوؤں کا رول بہت خاموش مگر پہلے کی طرح مؤثر ہے۔ اب انہوں نے ہنگاموں میں کُھلّم کُھلّا حصّہ لینے کے بجائے پیچھے بیٹھ کر رہنمائی کا فرض اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ وہ عیاری سے ایک شوشہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور خود بی جمالو کی طرح آگ لگنے کا تماشا کرتے ہیں۔ کھلنا میں میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اُس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آپ بھی سُن لیجئے:

میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ ایک ایسے ہوٹل میں گیا جہاں شام کو اکثر ہندو جمع ہوتے ہیں۔ ان ہندوؤں کے پاس وہ مسلمان بھی آ بیٹھتے ہیں جو ماضی میں سیاست کا کھیل اکٹھا کھیلتے رہے ہیں۔ میں وہاں ایک ایسے آدمی کی تلاش میں پہنچا جو کبھی صاحبِ اقتدار تھے۔ وہ تو ہمیں نہ ملے، تاہم ایک اور بڑے آدمی نظر آئے۔ وہ ایک ہندو سیاست دان سے محوِ گفتگو تھے۔ ہم دونوں ان کے قریب ہی دوسری میز کے گرد بیٹھ گئے اور اُردو میں باتیں کرنے لگے۔ اچانک میرے دوست نے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اپنے کان اُن کی باتوں پر لگا دیئے۔ بیس تیس سیکنڈ کے بعد میرے دوست نے اُٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلنے کے بعد میں نے پوچھا معاملہ کیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہندو سیاست دان کہہ رہا تھا: "مغربی پاکستان کے لوگ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے لوگ علیحدہ ہوجائیں گے۔ میں کہتا ہوں ہم یوں علیحدہ نہ ہوں گے۔ مغربی پاکستان اٹھارہ برس تک مشرقی پاکستان کا روپیہ کھاتا رہا ہے، پہلے ہم وہ روپیہ وصول کریں گے، پھر علیحدہ ہوں گے۔"

دیکھی آپ نے خفیہ ہاتھ کی صفائی؟

اس نازک مسئلے کا حل کسی ایک دماغ کے بس کی بات نہیں۔ اس پر تمام سنجیدہ حلقوں کو مل جُل کر سوچنا

چاہیئے۔ اسلام اقلیتوں سے فیاضانہ سلوک کی تعلیم دیتا ہے اور ہمیں ان کی جان، مال اور آبرو کی پوری پوری حفاظت کرنی چاہیئے۔ لیکن اس بات کی اجازت تو کوئی ملک نہیں دے سکتا کہ اقلیت اس کی بنیادیں کھوکھلی کرتی جائے۔ آستین میں چھپے ہوئے خنجر سے ہر وقت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ پھر یہ اقلیت بھی وہ ہے جو ہماری اکثریت سے برابر والے ملک میں بستی ہے ـــــ وہ ملک جس کی سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ پاکستان ختم ہو جائے۔

(خدا پاکستان کو دشمنوں سے محفوظ رکھے)

مسائل
کا
قابلِ عمل حل

مجھے یقین ہے ہندو اقلیت کے اسی مؤثر طبقے نے چند اور عوامل سے فائدہ اُٹھا کر ایک اور فتنہ کھڑا کر دیا۔ وہ ہے مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں سے نفرت —— حالات و شواہد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مشرقی پاکستان کے انصار شروع ہی سے مہاجرین سے نفرت کرتے تھے۔ اس کے برعکس آنکھوں نے یہ مناظر دیکھے کہ انصار نے مہاجرین کو اپنے گھروں میں ٹھہرایا، مالی اعانت کی اور محبّت سے پیش آئے، لیکن دو تین برس بعد ہی صورتِ حال تبدیل ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۵۴ء میں باہمی نفرت عروج پر تھی۔ اسی نفرت نے سیاسی واقعات پر گہرا اثر ڈالا، سازشیں ہوئیں، وزارتیں بدلیں اور نفرت کا لاوا کبھی پھٹ پڑا اور کبھی اندر ہی اندر پکتا رہا —— اب حالت یہ ہے، معاملہ ہوتا کچھ ہے اور شکل اختیار کر لیتا ہے بنگالی اور غیر بنگالی منافرت کی۔ مئی ۱۹۶۶ء کی ایک شام کو چٹاگانگ لاقانونیت کے جس دَور سے گزرا، قانون شکن عنصر نے عورتوں اور مردوں سے جو سلوک کیا، جس انداز سے فقرے کَسے اور جو اشتعال انگیز نعرے لگائے وہ افسوسناک ہونے کے علاوہ شدّتِ مرض کی غمّازی کرتے ہیں۔

اس تکلیف دہ صورتِ حال میں صرف ایک بات دل کو سکون اور اطمینان بخشتی ہے وہ یہ کہ دیہات کا بہت بڑا حِصّہ نفرت کی اُس زہر آلود فضا سے پاک ہے جو بڑے بڑے شہروں میں پیدا ہو گئی ہے اور شہر کے جو لوگ خاندانی روایات سے رشتہ توڑ نہیں بیٹھے، وہ بھی اپنے سینوں میں اُردو زبان اور اُردو زبان بولنے

والوں کے لیے عزت و احترام کے جذبات رکھتے ہیں — اور یہ جذبات بالکل فطری اور بے ساختہ ہیں۔
ایک واقعے نے میری رُوح کو مسرت اور طمانیت سے بھر دیا۔ میں جب تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر اُترا، تو پی آئی اے کی وردی میں ملبوس ایک مزدور میرا سامان اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا، وہ شکل و صورت سے بنگالی نظر آتا تھا، مجھ سے ٹوٹی پھوٹی اُردو بول رہا تھا، اُردو اخبار میں لپٹا ہوا ایک بنڈل کُھل گیا۔ میں نے چیزیں چُن لیں اور اخبار ایک کونے میں پھینک دیا۔ مزدور چلتے چلتے رُک گیا، اُس نے سامان نیچے رکھا اور اخبار کی طرف لپکا۔ مَیں نے کہا: اس میں کُچھ نہیں، سب چیزیں اُٹھالی ہیں — لیکن وہ ہوا میں اُڑنے والے اخبار کے پیچھے دوڑتا رہا۔ آخر اُسے پکڑ لیا۔ آنکھوں سے لگایا، مُنہ سے چُوما اور بڑے احترام سے تہہ کر کے اُونچی جگہ رکھ دیا۔ میرے لیے یہ منظر بالکل نیا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ مزدور نے اخبار کے ساتھ اس قدر احترام کا سلوک کیوں کیا۔ میری ہر لحظہ بڑھتی ہوئی حیرت کو دیکھ کر ایک ساتھی نے بتایا:

"پُرانی وضع کے لوگ اُردو زبان کو علم و فضل کی زبان سمجھتے ہیں۔ اُردو میں لکھی ہوئی تحریر احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ وہ کاغذ جس پر اُردو لکھی ہوئی ہو، پاؤں کے نیچے آئے"۔

آیئے، ان عوامل اور محرّکات کا کھوج لگائیں، جو محبت کو نفرت میں تبدیل کرنے کا موجب بنے ہیں۔

محبت کو نفرت میں تبدیل کرنے والے عوامل چند فطری ہیں اور چند غیر فطری۔ پہلے غیر فطری عوامل زیرِ بحث آئیں گے۔

باہر سے آنے والے لوگ زیادہ تر بہار، یوپی اور سی۔ پی سے آئے۔ ان کی پرورش خاص ماحول میں ہوئی تھی، ان کی تہذیب، ان کا تمدن اور ان کی خاندانی روایات، مشرقی پاکستان کے تمدن سے یکسر مختلف تھیں، وہاں رکھ رکھاؤ، لباس کی تراش خراش، کھانے پینے کے طور طریق پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اور یہاں سادگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب یہ دونوں تہذیبیں آپس میں ملیں، تو باہر سے آنے والوں کو بڑی شدت سے ماحول کی اجنبیت کا احساس ہوا۔ ان کی نگاہیں جس زندگی کی عادی تھیں، اس کی ہلکی سی جھلک

بھی مشرقی پاکستان میں نظر نہ آتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ چند ہی مہینوں بعد مہاجرین کے ایک بڑے حصّے نے کھُلم کھُلا یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمارا تمدّن اور ہماری تہذیب یہاں کے رہنے والوں کی تہذیب سے بہت برتر اور اعلےٰ ہے اس لیے ہمارے تمدّن اور ہماری زبان کو زندہ رہنے کا حق ہے اور مشرقی بنگال میں تو سرے سے کوئی تمدّن اُبھرا ہی نہیں۔ آغاز میں ان باتوں کا ردّ ِعمل بہت خفیف تھا، لیکن جب یہ باتیں بار بار دہرائی گئیں، تو شہروں کے نوجوان طبقے میں شدید ردّ ِعمل پیدا ہونے لگا۔ ۱۹۵۰ء سے طلبہ اس مسئلے پر منظّم ہوتے رہے اور انہوں نے جواب میں کہنا شروع کیا کہ جب حضور والا کو ہمارا تمدّن پسند نہیں، تو آپ یہاں تشریف کیوں لائے؟ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۴ء کے ہنگامے اسی کشمکش کا نتیجہ تھے۔

اس کشمکش کو مغربی پاکستان سے آنے والے سرکاری افسروں نے اور تیز کر دیا۔ یہ افسر زیادہ تر وہ تھے جن کو انگریز کے عہدِ حکومت میں تربیت مِلی تھی ——— اس تربیت میں ہمدردی اور شفقت کے بجائے سختی اور انتظامی وقار کا عنصر غالب تھا۔ مشرقی پاکستان کے لوگ یہ اُمّید لگائے بیٹھے تھے کہ آزادی مِل جانے کے بعد فضا بدل جائے گی اور اربابِ حکومت اِن کے مسائل پر بھائیوں کے مسائل کی طرح غور کریں گے۔ ان کی اُمّید کا شیشہ چکنا چُور ہو گیا۔ اِن افسروں کے طرزِ عمل سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو کسی مرحلے پر یہ احساس نہ ہوا کہ وہ آزاد ہو گئے ہیں، پھر ان بڑے صاحبوں کی سرپرستی میں کلب قائم ہوئے اور ان میں آہستہ آہستہ وہ سب کچھ ہونے لگا جن کے لیے کلب بدنام ہیں۔ مشرقی پاکستان کے لوگ خرابات کے مزاج آشنا نہ تھے۔ اُنہوں نے یہ جانا کہ یہ لوگ ہمارے اندر اخلاقی بے راہ روی پھیلانا چاہتے ہیں؛ چنانچہ یہ احساس شدّت اختیار کرتا چلا گیا اور پھر یہ نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ افسروں کے خلاف نفرت تمام مہاجرین کی طرف منتقل ہوتی رہی۔

اسی مرحلے پر ہندو اقلیّت نے اپنا رول ادا کیا۔ وہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر مہاجرین کے خلاف اُکساتے رہے کہ وہ تو تمہاری زبان اور کلچر ہی کو ختم کر دیں گے۔ بھارت سے بنگلہ لٹریچر بڑی تعداد میں مشرقی پاکستان آ رہا تھا۔ اس لٹریچر میں بنگالی اور غیر بنگالی میں منافرت پیدا کرنے کے قوی جراثیم موجود تھے۔ یہ جراثیم پھلتے پھولتے رہے۔ ہندو اقلیّت کو نظر آ رہا تھا کہ مہاجرین کے آباد ہونے سے مشرقی پاکستان پر

اس کی معاشی گرفت کمزور پڑ جائے گی، چنانچہ اس نے عیاری سے انصار اور مہاجرین میں پھوٹ ڈلوانے کی ہر موقع پر کوشش کی۔ اس نے پیچھے بیٹھ کر سیدھے سادے مگر جذباتی نوجوانوں کو گمراہ کن نعرے دیے۔ انہیں تخریب کا راستہ دکھایا اور بھارت سے آنے ہوئے پیسے کے ذریعے سیاست پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ ہندو اقلیت کا فتنہ پرور طبقہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر انصار اور مہاجرین متحد ہو گئے، تو ان کا سارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا، اسی لیے وہ مختلف حربوں سے منافرت کی خلیج وسیع کرنے میں مصروف ہے۔ اب ہم فطری اسباب کی طرف آتے ہیں۔

مہاجرین کا ایک عنصر اونچی ملازمتوں میں تھا۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر مشرقی بنگال کے لوگوں کو اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہونے نہ دیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کے قبضے میں صرف ایک آئی۔ سی۔ ایس آیا اور وہ بھی جلد ہی ریٹائر ہو گیا۔ اس خلا کو مہاجرین نے پُر کیا۔ ریلوے میں زیادہ تر یو۔ پی کے لوگ تھے۔ عدالتوں کے اعلیٰ عہدے باہر سے آنے والوں کو ملے۔ انتظامیہ میں بڑی تعداد مہاجرین کی تھی۔ شروع کے تین چار برس بڑے سکون سے گزر گئے، مگر جُوں جُوں مشرقی پاکستان میں تعلیم پھیلتی گئی، تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے معاشی مسئلہ اہمیت اختیار کرتا چلا گیا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ خواہش بالکل فطری تھی کہ ملازمتیں انہیں ملنی چاہییں، لیکن جب اُنہوں نے دیکھا ملازمتوں پر مہاجرین قابض ہیں، تو ان کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہوا۔ ہندوؤں نے اس ردِّ عمل کو شدید تر کرنے کے لیے انتہائی گھٹیا کردار ادا کیا۔ ملازمتوں کی اس کشمکش نے آخر کار مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کشمکش کی صُورت اختیار کر لی۔

بالکل یہی صورتِ حال صنعتی اور کاروباری میدان میں کار فرما تھی۔ بمبئی سے ایک ایسا طبقہ مشرقی پاکستان آیا جو کاروبار میں کئی خاندانوں کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے آتے ہی کاروبار سنبھال لیا اور چند برسوں میں پُورے صُوبے کی معیشت پر چھا گیا۔ دُوسری طرف صنعتی میدان میں مغربی پاکستان کے لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے تجربے اور صلاحیت کی بدولت ترقی پذیر صنعتیں قائم کیں۔ شروع شروع میں یہ سب کچھ غیر محسوس انداز میں ہوتا رہا، لیکن بعد میں کچھ تو ہندو اقلیت کے اُکسانے پر اور کچھ معاشی تقاضوں سے مجبور ہو کر مشرقی پاکستان

کے رہنے والے اس صورتِ حال کو شدّت سے محسوس کرنے لگے۔ انہیں احساس ہوا کہ ہماری زمین، ہمارے وسائل اور ہمارے مزدوروں سے باہر کے لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور ہماری معاشی بدحالی ویسی ہی ہے جیسی عہدِ غلامی میں تھی۔ ان کے دلوں میں یہ فطری خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی معاشی حالت بہتر ہونی چاہیے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ بھی تجارت، صنعت و حرفت اور کاروبار کے میدانوں میں آگے بڑھیں، لیکن ان کا راستہ بڑی حد تک رُکا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ کہ شدید قسم کی جھنجلاہٹ اور جوشِ انتقام پیدا ہوا۔ سیاسی قائدین نے احساسِ انتقام کو نتائج پر غور کیے بغیر صرف وقتی مفادات کے لیے خُوب ہوا دی۔ یہ انہی کا کیا دھرا ہے کہ نفرت کی چنگاریاں بُجھنے میں نہیں آتیں۔

اس کشمکش کو غیر فطری رُخ دینے میں انصار کا ایک طبقہ برابر کا ذمّے دار ہے۔ مہاجرین کے ایک عنصر نے دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو مشرقی پاکستان کی تہذیب اور زبان میں مدغم کرنے کی پُرخلوص کوشش کی۔ اس نے اپنے بچّوں کو بنگلہ زبان سکھائی اور وہ اہلِ زبان کے سے لب و لہجے میں کامل قدرت کے ساتھ بنگلہ بولنے لگے، مگر انہیں بنگالی بھائیوں نے اپنے تمدّن میں جذب ہونے سے روک دیا۔ وہ ہر شخص کو فرزندِ زمین (SON OF THE SOIL) کے پیمانے سے ناپتے ہیں، یعنی وہ صرف اسی شخص کو اپنے معاشرے کا فرد تسلیم کریں گے جس کی ماں مشرقی پاکستان کی ہو۔ اس فرزندِ زمین کی دیوار نے مشرقی پاکستان کے معاشرے کو مستقل طور پر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اب جوں جوں بنگالی بھائیوں کو زیادہ اختیارات ملتے جا رہے ہیں، اسی نسبت سے غیر بنگالی مسلمانوں کے لیے معاشی راستے مسدود ہو رہے ہیں۔ بنگالی بھائیوں نے معاشرتی بہاؤ کا فطری راستہ بند کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ تہذیبیں تو بنتی ہیں جذب و انجذاب کے عمل سے ـــ آپ اس عمل میں جتنی رکاوٹیں ڈالیں گے، نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ ان رکاوٹوں سے کسی کو بھی فائدہ نہ ہوگا اور کھچاؤ کی فضا مستقل طور پر قائم رہے گی۔

دوسری بڑی زیادتی اُردو زبان کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہاں بھی زبانوں کے فطری تقاضے نظرانداز

کر دیے گئے۔ مانا، مہاجرین سے آغاز میں کچھ بے اعتدالیاں سرزد ہوگئیں، لیکن اس کا یہ ردِ عمل کسی اعتبار سے مناسب نہیں کہ ان کی زبان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہو جائیں، اُردو زبان مشرقی پاکستان میں ایک صدی سے بولی جا رہی ہے، ابھی اس سرزمین میں ہزاروں دینی مدارس اُردو زبان کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اُردو زبان میں اسلام پر گرانقدر لٹریچر موجود ہے۔ اس میں ہماری مشترکہ تاریخ، ہماری مشترکہ تہذیبی روایات، ہماری مشترکہ دینی شخصیتوں اور ہماری مشترکہ دینی کتابوں کے ذخائر ملتے ہیں۔ یہ سرمایہ ہم سب کو یکساں عزیز ہے۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اُردو زبان کو ریاست کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے خلاف نفرت کے کیا معنی؟ اس کو صرف اس بنا پر دیس نکالا دینا ہوش مندی نہیں کہ مغربی پاکستان میں بنگلہ رائج نہیں۔ زبان کے مسائل کبھی اس قسم کے جذباتی اظہار سے طے نہیں ہوئے، انہیں فطری طور پر حل ہونے کا موقع دیجئے۔

یہ کتنی دردناک بات ہے کہ مسلمان اور ان کی زبان، پاکستان ہی کے ایک خطے میں اقلیت کا درجہ بھی حاصل نہ کر سکے۔ ہر متمدن اور انصاف پسند معاشرہ اپنی اقلیت کی زبان اور کلچر کی حفاظت کرتا ہے، یا کم از کم اقلیت کو اس بات موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے کلچر اور زبان کی حفاظت کی مساعی کر سکے، لیکن کس قدر بدقسمت ہے اُردو زبان کہ مشرقی پاکستان میں اسے کہیں بھی جائے اماں نہیں ملتی۔

اس سے زیادہ بدقسمتی یہ ہے کہ وہ لوگ جو اُردو زبان کا دم بھرتے ہیں، وہ بھی اس زبان کی تعلیم اور تدریس کے لیے سرگرم نظر نہیں آتے۔ میں نے کھلنا میں وہ سکول دیکھا جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ بیسویں صدی کی عمارت میں ہوں۔ بجلی کے پنکھوں سے محروم کمرے، فضا میں اداسی اور بے بسی رچی بسی ہوئی۔ بچوں کے چہرے بے چارگی میں ڈوبے ہوئے — اتنی روحانی تکلیف ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا یہ وہ شہر ہے جہاں اُردو بولنے والے اتنے متمول ہیں کہ چاہیں تو ایک عظیم الشان جامعہ تعمیر کر دیں مگر بالکل بے حس ہیں۔ اپنے بچے انگریزی سکولوں میں بھیجتے ہیں، عوام کے مسائل سے انہیں کیا سروکار؟ ڈھاکہ میں جو اُردو کالج ہے، اس کی حالت قدرے بہتر ہے، مگر اس کی ترقی کے امکانات محدود ہوتے جا رہے ہیں۔ میں

تمام سیکنڈری بورڈز کے اعداد و شمار جمع نہ کر سکا۔ (وہاں ہر ڈویژن میں ایک سیکنڈری بورڈ ہے) صرف ڈھاکہ سیکنڈری بورڈ کے فراہم شدہ اعداد و شمار کے مطابق ۶۵/۱۹۶۶ء میں ساڑھے تین ہزار طلبہ نے میٹرک میں اُردو زبان کا مضمون لیا۔ ان میں سے ایک کی بھی فرسٹ ڈویژن نہ آئی۔ سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے والوں کی تعداد پچھتر سے زیادہ نہ تھی۔ پاس ہونے والے نو سو کے لگ بھگ تھے۔

بھارت سے آنے والے جن کی تعداد ساٹھ ستر لاکھ سے کم نہیں، اب بھی اپنے آپ کو مہاجر سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ معاشرے کا جز نہ بن سکے۔ ان کے اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا کہ اگر وہ بچوں کو بنگلہ پڑھاتے ہیں، تب بھی ان پر ملازمتوں کے دروازے بند ہیں، اور اگر اُردو پڑھاتے ہیں تب بھی مقہور و مظلوم ہیں، آخر وہ کیا کریں؟ اہلِ استطاعت اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں میں بھیج دیتے ہیں۔ کیا غضب ہے کہ بنگلہ، اُردو کشمکش سے انگریزی زبان کے ہاتھ مضبوط ہو رہے ہیں، اور ہم اس کا خوشی خوشی خیر مقدم کر رہے ہیں۔ لیکن قومی زبانوں کے معاملے میں ہماری رواداری کہاں چلی جاتی ہے۔ ہائے! ہم تعصبات سے اندھے ہو گئے اور قومی مسائل اندھوں کی طرح اُلجھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس تہذیبی کشمکش نے اقتصادی اور سیاسی کشمکش کا رنگ اختیار کر لیا۔ مشرقی پاکستان میں جونہی حالات ذرا کشیدہ ہوئے، سرمایہ مغربی پاکستان منتقل ہونے لگا۔ آپ جانتے ہیں سرمایہ دار بہت حساس اور کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں اگر حالات زیادہ خراب ہو گئے اور لوگ توڑ پھوڑ پر اتر آئے، تو نہ معلوم ان کا کتنا نقصان ہو جائے، اس لیے وہ بھنک پڑتے ہی احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں۔ اب سوچیے، یہ صورتِ حال کس کے لیے نقصان دہ ہے؟ مشرقی پاکستان کی معیشت، جسے استحکام کی سخت ضرورت ہے، اگر آئے دن اسی طرح کے جھٹکے کھاتی رہے، تو ڈر ہے اس کی بنیادیں کبھی مضبوط نہ ہو سکیں گی۔ خبر نہیں جو حضرات ایسے کھچاؤ اور تناؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں، ان کے پیشِ نظر کیا ہے۔ وہ یقیناً مشرقی پاکستان کے بہی خواہ ہیں نہ پورے پاکستان کے، وہ شاید حشر اٹھا کر اپنے ہاتھ رنگنا چاہتے ہیں۔

ہیں۔ اس اقتصادی ناہمواری کا سیاست پر یہ اثر پڑا کہ اردو بولنے والے کی بڑی تعداد صدر ایوب کی پرجوش حمایت کرتی ہے۔ اس حمایت کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے عہد میں مشرقی پاکستان نے حیرت انگیز ترقی کی، لیکن ایک اور وجہ نفسیاتی بھی ہے، وہ یہ محسوس کرتے ہیں اگر زمامِ اقتدار مشرقی پاکستان کے ہاتھ میں آگئی، تو ان کی زندگیاں سخت خطرے میں پڑ جائیں گی، چنانچہ وہ علاقے اور بستیاں جہاں اُردو بولنے والے رہتے ہیں، صدارتی انتخاب میں صدرِ پاکستان کے مضبوط مرکز ثابت ہوئے۔ یہ نفسیاتی احساس بنگالی اور غیر بنگالی میں سخت کشیدگی پیدا کر رہا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے فوری اور مؤثر اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔

مجھے ایک پچپن سالہ جواں ہمت باپ کی اشکبار آنکھیں کبھی نہ بھولیں گی۔ میں راج شاہی سے ڈھاکہ آرہا تھا۔ رات کے نو بجے ٹرین کو خیرباد کہہ کر سٹیمر میں سوار ہوا۔ دیر تک دریا میں موجوں کے اٹھنے اور پھیل جانے کا نظارہ کرتا رہا۔ ایک صاحب میرے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ ان پر ایک نظر ڈالی، بال سفید تھے اور چہرے پر غم کے آثار جھرّیوں کی شکل میں ثبت تھے۔ سلام کیا۔ انہوں نے نہایت شستہ لہجے میں وعلیکم السلام کہا۔ باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ ریلوے کے ایک بڑے افسر تھے۔ وہ سمجھ دار اور محتاط آدمی نظر آئے میں نے پوچھ لیا کیسی گزر رہی ہے، کہنے لگے: "وہ جس حال میں رکھے، اس کا شکر بجا لانا چاہیئے۔" میں نے ذرا اور کریدا، تو وہ خاموش ہو گئے اور دُور خلا میں گھورنے لگے۔ خبر نہیں ان کی آنکھیں کیوں ڈبڈبا آئی تھیں ان کی زبان سے صرف چند کلمات نکلے —— اور پھر وہ بات ہی نہ کر سکے۔ یہ کلمات ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے جیسے کوئی جگر لختِ لخت کو جمع کر رہا ہو۔

"ہم یہاں کس شوق اور کس آرزو سے آئے تھے سب کچھ لٹا کر زندگی کی بازی جیت گئے۔ مگر یہاں آکر تو متاعِ زندگی لٹ گئی۔ غیروں کے زخم ہنس ہنس کر سہے، اب اپنوں کے لگائے ہوئے زخموں کا کیا کریں اپنے ہی ملک میں اجنبی اجنبی سے نظر آتے ہیں۔"

ستم یہ کہ کسی سیاسی جماعت نے یہ اہم مسئلہ اپنے منشور میں شامل نہیں کیا۔ بنگالی اور غیر بنگالی کے کشیدہ

تعلقات ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے اور دشمن ہمیشہ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ دونوں کے جذبات بھڑکا کر آنِ واحد میں ہنگامی حالات پیدا کر سکتا ہے۔ ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔

اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ دونوں طرف سے رواداری، تحمل اور فہم و بصیرت سے کام لیا جائے۔ یہ تحمل اور رواداری سیاسی اور دینی جماعتیں پیدا کر سکتی ہیں۔ اخبارات کا تعمیری کردار بہت موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ منافرت میں اضافہ کرنے والے واقعات کو ہوا دینے کے بجائے اسلامی تاریخ سے ایسے واقعات پیش کریں جن سے اخوت و مودت کی فضا پیدا ہوتی ہو۔ کاش! کسی اخبار کو یہ سعادت نصیب ہو جائے۔

اس مسئلے کا اور اس سے متعلق دوسرے مسائل کا ایک حل یہ بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے معیاری ادارے قائم کیے جائیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان دو اداروں نے برصغیر ہند کے مسلمانوں میں فکری وحدت اور اجتماعی شعور پیدا کرنے میں نہایت اہم حصہ لیا۔ ان میں تعلیم پانے والے، علاقائی اور لسانی تعصبات سے بہت بلند ہو کر سوچتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والوں پر ایک ایسی فکری چھاپ لگ جاتی کہ وہ جہاں بھی ہوتے اپنے افکار و خیالات سے فوراً پہچانے جاتے۔ کیا ہم وہی تجربہ پاکستان میں نہیں کر سکتے؟ بد قسمتی سے ہم اب تک نہ کر سکے۔ دینی درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کی یہاں کمی نہیں، لیکن ایسے ادارے ابھی تک وجود میں نہیں آئے جن کی شہرت اور عظمت سے متاثر ہو کر تشنگانِ علم کشاں کشاں کھنچے چلے آتے۔ ہم نے بہاول پور میں اسلامی یونیورسٹی قائم کی، لیکن وہ اہلِ پاکستان میں روح اور جذبہ نہ پھونک سکی۔ لاہور میں جامعۂ اشرفیہ اور ڈھاکہ میں مدرسۂ عالیہ خاصی شہرت رکھتے ہیں، لیکن ان کی شہرت دوسرے بازو تک نہ پہنچ سکی۔ جدید طرز کی ایک بھی یونیورسٹی اس قابل نہیں کہ اسے پاکستان گیر ادارہ کہا جا سکے۔ آخر ایسا کیوں؟ دراصل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دارالعلوم دیوبند، پیداوار تھے مسلمانوں کی مضبوط فکری اور دینی تحریکوں کی۔ ان کے قیام سے پہلے مسلمانوں کے شعور کو مختلف طریقوں سے بیدار کیا گیا تھا۔ اور جو بیدار کرنے والے تھے ان کا کردار صاف ستھرا اور ان کی شخصیتیں عظمت کی منہ بولتی تصویریں تھیں۔ ان فاضلین نے اپنے گرد اس وقت کے نابغے جمع کر لیے اور اس جوش و خروش اور عزم و استقلال سے کام کیا کہ مسلمانوں کا دینی، سیاسی اور اجتماعی شعور بالآخر جاگ

اُٹھا۔ پھر ان تحریکوں کی پشت پر عام فہم اور مدلل لٹریچر تھا۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق صرف ایک رسالہ نہ تھا، وہ علمی، فکری اور تہذیبی تحریک کا روح رواں تھا۔ اسی طرح اُس دور کی تمام تنومند تحریکیں اپنے ساتھ فکری اور علمی سرمایہ رکھتی تھیں ــــ ان اداروں کے اساتذہ اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ واضح اور منفرد مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ اداروں کا ماحول اور نظم، طالب علم کو کردار وافکار کے خاص سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔

ہمارا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ کوئی تحریک اٹھتی ہے، نہ بلند و بالا شخصیتیں یکجا ہوتی ہیں، سیرت و کردار کے سوتے خشک ہو گئے، مادیت کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی پیاس نے روح و جذبے کو چوس لیا ہے، تاہم تعمیری کام کی تمام راہیں مسدود نہیں ہو گئیں۔ دو تین برس پہلے یہ بات سننے میں آئی تھی کہ مشرقی پاکستان میں علی گڑھ یونیورسٹی کے انداز پر ایک عظیم الشان جامعہ تعمیر ہونے والی ہے۔ یہ بھی سُنا تھا کہ جناب اے، ٹی، ایم مصطفےٰ مرحوم اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، لیکن پھر خاموشی طاری ہو گئی ــــ پُر اسرار خاموشی۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان میں علی گڑھ کی طرز کا مکمل آزاد ادارہ قائم کرنا چاہیے جس میں چوٹی کے ماہرینِ تعلیم جمع کیے جائیں، ہر مضمون کے ایسے جیّد اور فاضل اساتذہ موجود ہوں جن کا نام سُن کر والدین اپنے بچوں کو خوشی خوشی اس یونیورسٹی میں بھیجیں، بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پروفیسروں کی خدمات حاصل کی جائیں، ماحول اور نظامِ تربیت میں قومی شعور اس قدر رچا بسا ہو کہ طلبہ قومی امنگوں اور تعمیرِ وطن کی آرزوؤں سے سرشار ہو جائیں، اس یونیورسٹی میں قومی مسائل کے مختلف شعبے ہونے چاہئیں جن میں ذہین طلبہ کسی قومی مسئلے پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کر سکیں۔ اس یونیورسٹی پر خاصا خرچ آئے گا، لیکن قومی اتحاد کے لیے یہ ناگزیر ہے۔ اچھے نتائج حاصل کرنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ نئی یونیورسٹی مکمل طور پر آزاد فضا میں کام کرے۔ اگر اسے سازگار ماحول میسر آگیا تو انشاء اللہ پندرہ بیس برس میں خالصتاً قومی مزاج پیدا ہو جائے گا، اور ملک کے ذہین نوجوان اپنا وقت اور صلاحیتیں منافرت کی چتا میں جھونکنے کے بجائے صرف قوم کی عظمت اور سربلندی کے لیے کام کریں گے۔

مشرقی پاکستان کے فہمیدہ طبقوں سے مل کر مجھے ایک اہم ترین مسئلے کا احساس ہوا۔ الفاظ تو پہلے بھی سنے تھے، لیکن حقیقی مفہوم سے آگاہی وہاں جاکر ہوئی۔ جن اصحاب سے میں نے یہ پوچھا کہ آپ کے ہاں اس قدر اضطراب کیوں ہے، ان میں سے ۹۸ فی صد نے ایک ہی جواب دیا:

"یہاں کے لوگوں کو یہ شدید احساس ہے کہ ہم حکومت میں شریک نہیں"

ان الفاظ پر میں نے شروع شروع ہی کوئی توجہ نہ دی اور یہی سمجھا کہ یہ ایک جذباتی نعرہ ہے، لیکن جب یہ الفاظ سمجھ دار لوگوں کے منہ سے سُنے، تو ان پر غور کرنا شروع کیا، پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا، اور ایک روز جب دو سابق وزیروں نے بھی یہی بات کہی، تو میں پھٹ پڑا:

"آپ یہ کیا گمراہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں؟ کون کہتا ہے مشرقی پاکستان کے لوگ حکومت میں حصّے دار نہیں۔ مرکزی کابینہ میں وزیروں کی تعداد برابر برابر ہے، قومی اسمبلی میں نمائندگی مساوی ہے، اور پھر مشرقی پاکستان کی حکومت میں عوام پوری طرح شریک ہیں۔ انتخاب کے ذریعے عوام کے نمائندے حکومت کے کاروبار سنبھالتے ہیں۔ آخر شرکت اور کیا ہوتی ہے؟"

میری پُرجوش آواز سن کر قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی گفتگو میں دلچسپی لینے لگے۔ ان میں ایک چوٹی کے قانون دان تھے اور ایک صاحب علم السیاست کے استاد۔ وہ سب کے سب مجھے بے طرح گھورنے لگے جیسے میں بیسویں صدی میں زمانۂ قبل از تاریخ کی باتیں کر رہا ہوں۔ ایک صاحب نے تو مجھے ایسی حقارت بھری نظروں سے دیکھا جیسے میں کوئی فریب کار یا حقائق کو مسخ کرنے والوں میں سے ہوں۔ ایک محترم نے قدرے طنزیہ انداز میں پوچھا: "آپ علم السیاست کے ابجد سے بھی واقف ہیں؟"

"جی ہاں"

"پھر بھی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں؟" ایک صاحب نے بُرا سا منہ بنایا جیسے کونین کی گولی نگل رہے ہوں۔

ان میں سے ایک صاحب کا سر بالکل سفید تھا، وہ ابھی تک خاموش بیٹھے تھے۔ میری نظریں انہی پر جمی

ہوئی نہیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ پھر ان کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی؛

"بیٹا، تمہارے خلوص اور جرأت نے مجھے خاصا متاثر کیا، لیکن یہ دیکھ کر دُکھ ہوا کہ تم سادگی سے ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو، کیا میری بات غور سے سنو گے؟"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: "جی ہاں"

"موجودہ آئین میں سارے اختیارات صدرِ پاکستان کو حاصل ہیں اور صدرِ پاکستان کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ مشرقی پاکستان اختیارات سے محروم ہے۔ دستوری اور واقعاتی اعتبار سے مرکزی کابینہ کی کوئی حیثیت نہیں، وزراء کا تقرّر اور برطرفی کلیّۃً صدرِ پاکستان کی صوابدید پر ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وزراء کے انتخاب میں عوام کا، یا عوام کے نمائندوں کا کوئی حصہ نہیں۔ پھر ذرا ستم ظریفی دیکھیے، مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے وزیروں کو وہ محکمے سونپے گئے جن کا مالیات سے بہت کم تعلق ہے، ملکی معاملات میں سب سے زیادہ اہمیت مالیات کی ہے اور وزیر خزانہ ہمیشہ مغربی پاکستان کے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وزیروں کی جو تھوڑی بہت حیثیت ہے اس میں بھی مشرقی پاکستان کا حصہ قابلِ ذکر نہیں۔ قومی اسمبلی بڑی حد تک توازنِ اختیارات برقرار رکھ سکتی تھی، مگر اس کے دستوری حقوق اتنے کم ہیں کہ وہ دو قدم لنگڑا کر بھی نہیں چل سکتی۔ امریکہ کی با اختیار سینیٹ نے صدر کے لامحدود اختیارات کے کہیں کہیں سے پر کاٹ دیے۔ سینیٹ کی مضبوط گرفت کا یہ عالم ہے کہ امریکہ نے جمعیتِ اقوام کے قیام میں سب سے زیادہ حصّہ لیا، لیکن اس وقت کے صدر نے یہ کام کرنے سے پہلے سینیٹ کو اعتماد میں نہ لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ سینیٹ نے صدر کی اس خارجی حکمتِ عملی کو مسترد کر دیا اور امریکہ جمعیتِ اقوام کا رکن نہ بن سکا۔ اس مثال سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ امریکہ نے جہاں صدر کو بے پناہ اختیارات دیے ہیں، وہاں ایسے ادارے بھی موجود ہیں جو ضرورت پڑنے پر مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں، ہمارے ہاں کی قومی اسمبلی کو وجاہت حاصل نہیں۔ ملک کا سب سے بڑا قانون ساز ادارہ حکومت کی طرف سے پیش کیے ہوئے آرڈی ننس میں ایک شوشے کی تبدیلی نہیں

کر سکتا۔ اس کا مالیات پر سرے سے کوئی کنٹرول ہی نہیں۔ آپ کو تو یہ بات معلوم ہوگی کہ مالیات کے کنٹرول کا مسئلہ انگلستان کی دستوری تاریخ میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔ برسوں دارالعلوم اور دارالامرا میں اس مسئلے پر کشمکش ہوتی رہی، وزارتیں ٹوٹیں، بادشاہت کے خلاف بغاوت ہوئی۔ دستوری انقلاب آئے عوام جانتے تھے اگر دارالعلوم کو مالیات پر کنٹرول حاصل نہ ہو، تو عوام کے نمائندے حکومت کے معاملات میں پوری طرح حصّہ نہ لے سکیں گے۔"

میں نے بات کاٹنا چاہی، مگر انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"میری بات ختم ہونے دیجیے، توڑ توڑ کر بات کرنے سے مسئلے کا مجموعی تاثر ختم ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح گاہے گاہے دستور میں چھوٹی موٹی ترمیم کرنے سے دستوری اصلاحات کا بنیادی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں ہماری قومی اسمبلی بالکل ہی غیر مؤثر ادارہ ہے۔ اس کے نمائندوں کو حکومت کے معاملات میں حصّہ لینے کا کہیں بھی موقع نہیں ملتا۔ پھر مشرقی پاکستان میں اختیارات کی باگ ڈور گورنر صاحب کے ہاتھ میں ہے اور گورنر صاحب کے تقرر کا دستوری حق صرف صدرِ پاکستان کو حاصل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہماری رائے اپنے صوبے کے اہم مسائل میں بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

"آپ کہتے ہیں، حکومت کے معاملات میں مشرقی پاکستان کے عوام کی رائے لی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، آپ لوگوں نے پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کر لیا اور ہم سے رسمی طور پر بھی رائے نہ لی۔ دارالحکومت کی تبدیلی معمولی بات نہیں۔ آپ نے پہلے بھی ہمارے حقوق پر چھری چلا کر کراچی کو بے پناہ وسعت دی اور اب اربوں روپے سے اسلام آباد تعمیر کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک ہماری رائے کا کوئی وزن ہوتا، تو ہمیں بھی مشورے میں شریک کیا جاتا۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔"

میں خاموشی سے فلسفیانہ انداز کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے سوا اور کیا کرتا۔ چاروں طرف نگاہوں کے بھالے میرا احصار کیے ہوئے تھے۔ پھر بھی جرأت سے کام لیتے ہوئے میں نے کہہ ہی دیا:

"آپ لوگ عہدِ افلاطون کی باتیں کر رہے ہیں عملی زندگی اور خیالی فضا میں ہمیشہ بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ آپ نے اس نظام میں ہزاروں کیڑے ڈالے ہیں، اس نے پاکستان کو سیاسی اور اقتصادی استحکام بخشا ہے۔ دیکھتے نہیں، وہ ڈھاکہ جس کی یونیورسٹی میں مشکل ہی سے ایک آدھ ٹیلی فون ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں ہزاروں کمروں میں گھنٹیاں بجتی ہیں۔ آپ لوگ ان حقائق سے کیوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں؟"

میرے قریب ہی ایک نوجوان بیٹھے تھے۔ چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیوں سے صحافی معلوم ہوتے تھے۔ وہ کڑک کر بولے:

"رہنے دو اقتصادی ترقی کی باتیں ہم جانتے ہیں یہ نوازشات کیوں ہیں؟"

اس سے آگے الفاظ ان کے حلق میں ٹوٹ گئے۔ چہرہ شدتِ جذبات سے تمتما اٹھا اور سرخ سرخ آنکھیں نکالتے ہوئے کہنے لگے:

"آپ لوگوں نے ہمیں کتا سمجھ لیا ہے کہ جب ذرا بھونکے، گوشت کے ٹکڑے ڈال دیے۔ ہم یہ ذلت زیادہ برداشت نہیں کریں گے۔"

میں سہم گیا۔ اور پھر تڑپ اٹھا جیسے کسی نے میری ٹانگ کھینچ لی ہو۔

شفیق بزرگ میری پریشانی بھانپ گئے۔ خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولے:

"بیٹا، سیاسی استحکام کسی آئین یا کسی سانچے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اصل استحکام کا انحصار سیاسی جماعتوں اور قائدین کے کردار پر ہے۔ اگر ہم پاکستان میں ایسے افراد تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اپنے اصولوں سے کسی قیمت پر اور کسی حالت میں منحرف ہونے کے لیے تیار نہ ہوں، تو واقعی ملک کو سیاسی استحکام مل گیا ہے۔ اصل اہمیت اس دماغ اور اس ہاتھ کو حاصل ہے جو آئینی مشینری کے پیچھے کام کرتا ہے۔"

ایک پرانے سیاست دان، جو اس ساری گفتگو میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے، سب سے آخر میں بولے:

"برا نہ مانو، تو ایک بات کہوں۔ مغربی پاکستان میں رہنے والوں کو صدارتی نظام کی "خوبیاں" اس

وقت معلوم ہوں گی اگر جب قدرتِ حق سے صدرِ پاکستان، مشرقی پاکستان سے منتخب ہو جائے، جمہوری نظام میں آپ یہ امکان خارج تو نہیں کر سکتے۔"

اس آخری جملے نے مجھے اندیشہ ہائے دُور دراز میں گرفتار کر دیا۔

پاکستان دو بازوؤں میں تقسیم ہے، اس لیے ہمارا آئینی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے جس میں اختیارات ایک فرد میں مرتکز ہونے کے بجائے ایک خاص تناسب سے دو جگہ تقسیم ہو جائیں۔ اگر ہمارے ملک میں جغرافیائی وحدت ہوتی، تو پھر شاید اختیارات کا ایک فرد میں مرتکز رہنا زیادہ پریشان کن بات نہ تھی لیکن تاریخ کی ستم ظریفی سے ہم دو دُور دراز حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ موجودہ صورتِ حال میں سربراہِ مملکت جس بازو کا ہو گا، دوسرے بازو کو ہمیشہ شکایت رہے گی۔ کہ یہ ایک ایسا نفسیاتی عمل ہے جسے کبھی روکا نہ جا سکے گا۔

اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ پارلیمانی نظامِ حکومت ضروری ترمیموں کے ساتھ بحال کر دیا جائے مشرقی پاکستان بلکہ پورے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا (مسلم لیگ کے سوا) یہ متفقہ مطالبہ ہے۔ پارلیمانی نظام میں دو بازوؤں کے لیے نفسیاتی تسکین کا سامان موجود ہے۔ اگر وزیرِ اعظم مشرقی پاکستان کے ہوں گے، تو مغربی پاکستان کے حصے میں مملکت کی سربراہی آئے گی اور اگر صدرِ مملکت کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہو گا، تو وزارتِ عظمیٰ پر مغربی پاکستان کے کوئی سیاست دان متمکن ہوں گے۔ اس نظام میں مقننہ کو بالادستی حاصل ہوتی ہے اور اس کے ارکان حکومت کے معاملات میں براہِ راست حصہ لیتے ہیں۔

پارلیمانی نظامِ حکومت نے پچھلے چودہ برس میں جو گُل کھلائے، ان کے پیشِ نظر بے شمار خدشات سامنے آتے ہیں۔ ان چودہ برس میں سیاسی جوڑ توڑ کے ڈرامے کہاں کھیلے جاتے رہے، یہ بحث دُور از کار ہے، بہرحال یہ تو ایک حقیقت ہے کہ پارلیمانی نظامِ حکومت ملک کے لیے مستحکم سیاسی بنیادیں فراہم نہ کر سکا۔ اب اگر اس نظامِ حکومت کو بحال کر دیا جائے، تو کیا پھر وہی ماحول پیدا نہ ہو جائے گا جس نے پاکستان کا وجود ہی خطرے میں ڈال دیا تھا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ہماری سیاسی جماعتوں کا مزاج کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوا۔ ایسی نئی قیادت بھی نہیں اُبھری جو بااصول اور بلند کردار ہو۔ سیاست کا اخلاقی معیار پہلے سے بھی گر گیا ہے ایسے "عظیم الشان" گروہوں اور افراد کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی جو راتوں رات اپنی وفاداریاں بدل لیتے ہیں۔ طالع آزما برسر اقتدار آنے کے لیے پھر وہی پُرانے حربے استعمال کریں گے۔

اِن حالات میں پارلیمانی نظام کی بحالی کیونکر ممکن ہے، امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ صدر ایوب صاحب بڑی آسانی سے پارلیمانی نظام قائم کر سکتے ہیں۔ اپنے عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے وہ جس مقام پر پہنچ گئے، وہاں ان کے لیے صدارتی نظام اور پارلیمانی نظام دونوں یکساں ہیں۔ انہوں نے ملک کو کیا کچھ نہیں دیا؟ اگر وہ پارلیمانی نظام بھی دے دیں، تو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں پھیلا ہوا اضطراب ختم ہو جائے اور اس سے صدر صاحب کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔

اگر پارلیمانی نظام کی بحالی مستقبل قریب میں ممکن نہ ہو، تو موجودہ آئین میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں جلد کر دی جائیں۔ یہ تبدیلیاں بیک وقت کی جائیں تاکہ عوام کو یہ احساس ہو کہ انہیں بہت کچھ دیا گیا ہے۔

۱: صدر کے ساتھ نائب صدر کی گنجائش دستور میں رکھی جائے۔ امریکہ کے صدارتی نظام میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ دستوری کمیشن نے بھی اس بات کی سفارش کی تھی۔ نائب صدر کے اختیارات واضح طور پر معین کر دیے جائیں۔ اِس مفروضے میں کوئی حقیقت نہیں کہ دو شخصیتوں میں اختیارات تقسیم ہو جانے سے تصادم کا خطرہ ہے۔ اگر سیاسی جماعت میں مضبوط ڈسپلن موجود ہو، تو تصادم کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ تصادم کا خوف ذہن پر سوار کر لیا جائے، تو پھر کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا۔

۲: قومی اسمبلی کو مالیات پر پورا کنٹرول ہونا چاہیے۔

۳: یہ اچھی روایت قائم کی جائے کہ وزراء اسمبلیوں کے اراکین میں سے لیے جائیں گے۔ وزیر بننے کے بعد وہ اسمبلی کی رُکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔

۴ : صوبوں کے گورنروں کو صوبائی اسمبلیاں یا عوام براہِ راست منتخب کریں۔

۵ : صدر، نائب صدر، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوں۔

آئینی ڈھانچے میں یہ تبدیلیاں ایک خوشگوار انقلاب کی نقیب ثابت ہوں گی۔

اب میں مسائل کے آخری مرحلے کی طرف آتا ہوں۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان، ہر جگہ قومی مفادات کے مقابلے میں شخصی، گروہی اور علاقائی تعصبات اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ ہم جب تک اصل اسباب تلاش نہ کریں گے اور ہمارے تعمیری کاموں کا رُخ صحیح سمت میں نہ ہوگا، صرف یہ کہہ دینے سے کہ علاقائی تعصبات روز بروز تقویت حاصل کرتے جا رہے ہیں، کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ ہمیں اس مسئلے پر بہت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ آخر ملک میں قومی مزاج کی تحریکیں عوام کے اندر سے کیوں نہیں اُٹھتیں۔ اگر ہمیں اسباب کی تہہ تک پہنچنا ہے، تو صاف گوئی سے کام لینا اور اپنے اندر حق بات سننے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ حکومت کی طرف سے سادگی اور پاکستانی مصنوعات استعمال کرنے کی تحریک چلائی گئی، مگر چند روز کے ہنگاموں کے بعد وہ معیارِ زندگی کے ملبے تلے دب کر دم توڑ گئی؟ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ اربابِ اقتدار کی پُر خلوص اپیلوں کے جواب میں پاکستانی صنعت کاروں نے مصنوعات کی قیمتوں میں کمی کرنے کے بجائے ان میں اور اضافہ کر دیا؟ کیا کوئی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی تمام اپیلیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں؟ جناب غلام فاروق صاحب کتنے دُکھ اور کتنے سوز کے ساتھ آئے دن یہ انتباہ کرتے ہیں کہ بیرونی قرضے ہماری معیشت کے لیے سخت نقصان دہ ہیں، ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہمیں قومی جذبے کے ساتھ برآمد میں اضافہ کرنا چاہیے، لیکن سچ سچ کہیے کیا ان دردمند باتوں سے کوئی عظیم الشان تحریک جنم لے سکی؟ کسی ایک ایسی تحریک کا نام لیجیے جو پچھلے دس بارہ برسوں میں اُٹھی ہو اور اس نے عوام میں ایک پائیدار شعور یا جذبے کو جنم دیا ہو۔ افکار (IDEAS) اور تحریکوں کے بغیر قوم میں وہ ولولہ اور جانفروشی

کیسے پیدا ہوگی جو بڑے بڑے مسائل سر کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ آیئے' جائزہ لیں کہ ہماری یہ صلاحیت کہاں چلی گئی ہے۔

عوام میں خیالات کی رَو سیاسی جماعتیں پیدا کرتی ہیں، وہ زمانہ جب برِصغیر کے مسلمانوں نے محیّر العقول سیاسی بیداری کا ثبوت دیا تھا، ہمارے تئیں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں ہوتا یہ تھا کہ ایک تحریک کسی جگہ سے اُٹھتی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل جاتی تھی۔ گھر گھر اس کے چرچے ہوتے، جوان رضاکار بنتے، عورتیں چندہ دیتیں اور بوڑھے نوجوانوں کی قیادت کرتے۔ تحریکِ خلافت کے رُوح پرور مناظر جن آنکھوں نے دیکھے۔ ان آنکھوں ہی کو دیکھ لو، یاد تازہ ہو جائے گی۔ یہ تحریکیں ملک گیر کیسے بن جاتی تھیں اور لوگ کسی دباؤ کے بغیر کیوں ایثار کرتے تھے' یہ سب باتیں گہرے تجزیے کا تقاضا کرتی ہیں۔

اس جوش و خروش کے پیچھے کئی مضبوط عوامل کام کرتے نظر آتے ہیں۔ سیاسی اور دینی جماعتوں کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی جو پہلے برسوں اخلاص، ریاضت' بے غرضی اور ملّی شعور سے کام لیتے ہوئے اپنے لیے عوام میں ایک مقام بنا لیتے تھے۔ وہ چور دروازوں سے کبھی قیادت کی بلند سطح پر نہیں آئے۔ تدریجی عمل کا نتیجہ یہ نکلتا کہ عوام اپنے دلوں میں اُبھرتے ہوئے قائدین کے لیے پہلے سے احترام اور عقیدت کے جذبات پرورش کرتے رہتے تھے۔ پھر یہ قائدین شہروں اور دیہاتوں میں جاتے، سارا شہر یا قصبہ ان کی تقریر سننے کے لیے اُمنڈ پڑتا۔ قائدین کی پُرکشش شخصیت کو دیکھ کر عوام میں ایک نیا جوش پیدا ہوتا۔ مقرّرین اپنی تحریک کے بنیادی نکات عوام کی ذہنی سطح کے قریب رہتے ہوئے بیان کرتے۔ بات دلوں میں اُترتی چلی جاتی اور اس طرح اس شہر سے نیا خون اور مضبوط کارکن میسّر آ جاتے۔ جلسوں میں شریک ہونے والے اپنے اندر ایک حرارت محسوس کرتے اور یہی حرارت اُنہیں سرگرمِ عمل رکھتی تھی۔ دوسری طرف قائدین کو بھی عوام کے احساسات کا پتا چلتا رہتا تھا۔ مقرّر کوئی بات حاضرین کی مرضی کے خلاف کہتا، تو وہ مختلف طریقوں سے احتجاج کرتے۔ قائد کو معلوم ہو جاتا کہ یا میں اپنی

بات صحیح طور پر کہہ نہ سکا، یا وہ بات عوام کے مزاج کے خلاف ہے۔ جلسوں میں کمزور قائد ٹھہر ہی نہ سکتا تھا۔ اس طرح جلسہ گاہیں قیادت کے لیے عملی تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جلسوں کے مراحل سے گزر کر آگے آنے والے قائدین انقلاب آفریں شخصیت کے مالک بن جاتے تھے۔

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ جلسے اور جلوسوں پر پابندی لگ جانے سے قوم کا تحریکی مزاج قریباً قریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب قائدین یا تو پریس کانفرنسوں سے خطاب کرتے ہیں یا زیادہ حوصلہ کیا، تو کسی مختصر سے ہال میں سو ڈیڑھ سو دانشوروں سے میٹھی اور تلخ باتیں کریں۔ بیس لاکھ کے بھرے پُرے شہر میں سے اگر آپ سو ڈیڑھ سو آدمی کو اعتماد میں لیتے ہیں، تو بے چارے عوام آپ کی بڑائی اور اپنی کم نصیبی کے بارے میں کیا محسوس کریں گے۔ جب ہمارے قائدین عوام سے براہِ راست خطاب کرنے کے بھی روادار نہیں، تو پھر عوام کو ان کی تقریروں اور بیانات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، دل کیسے دھڑک سکتے ہیں، تحریک کیسے اُٹھ سکتی ہے۔ دوسری طرف موچی دروازے کی جلسہ گاہ سے اُبھرنے والے قائد کا قد و قامت اس قائد سے بہت بلند و بالا ہوتا تھا جو اب "محفوظ ہال" سے اُبھرتا ہے۔ اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں کہ کسی قائد کو ہال میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر اخبار کے ایڈیٹر سے اس کی دوستی یا کسی نوع "کا تعلق" ہے، تو اخبار کے پیمانے سے وہ پاکستان کا سب سے بڑا لیڈر ہوگا۔ جان کی امان پاؤں، تو عرض کروں کہ اب بڑے سے بڑا لیڈر یہ دیکھتا ہے کہ اس کی تصویر کتنے اخباروں میں چھپی اور کتنے اِنچ جگہ ملی۔ اس اندازِ فکر سے زندہ تحریکیں خود فریبی کے قبرستان میں دَب تو سکتی ہیں، کوئی جاندار تحریک اُبھر نہیں سکتی۔

جاندار تحریک اُٹھے گی، تو چھوٹے موٹے مسائل سر ہی نہ اُٹھا سکیں گے۔ افراد کی صلاحیتیں نور و آن کی طرح اُبل پڑیں گی، جوش و خروش کا عجب عالم ہوگا۔ عظیم مقاصد کی لگن عوام کو ہر لحظہ مصروف رکھے گی۔ پھر جرمنوں کی طرح ہمارے انجنیئر، ہمارے کارخانہ دار، ہمارے کاشت کار، ہمارے اساتذہ اور ہمارے اہلکار کسی دباؤ کے بغیر رات کے بارہ بجے تک کام کریں گے۔ ہماری زمین سونا اُگلے گی، ہمارے

نوجوان کردار کے اعتبار سے سونے کی ڈلی ہوں گے۔ پھر ہر فرد اپنی شخصیت کا اظہار محنت کے واسطے سے کرے گا۔

ملک ابھی دورِ تعمیر میں داخل ہوا ہے، بے شمار شعبوں میں تندہی سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور کتنے ہی ایسے مسائل ہیں جو ہمہ گیر تحریکوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ میں ان تمام امور کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آج کی نشست میں صرف ایک مسئلہ پیش کرتا ہوں جس پر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر عظیم الشان تحریک چلائی جانی چاہیے۔ اس مسئلے کی اہمیت واضح کرنے کے لیے میں چند متعلقہ مسائل کا ذکر کروں گا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی پروگرام کا مرکزی نقطہ ہے کہ مشرقی پاکستان جو زرِ مبادلہ کما رہا ہے، اس کا بڑا حصہ مغربی پاکستان پر خرچ ہوتا ہے۔ ان چھ نکات میں سے چار نکات صرف اسی مقصد کے لیے پیش کیے گئے کہ مشرقی پاکستان جو زرِ مبادلہ کماتا ہے، وہ اسے خود استعمال کرنے کا مجاز ہو اور دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر کوئی ایسا نظام قائم کیا جا سکے جس کے تحت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی برآمد برابر برابر ہو، تو مشرقی پاکستان کا اضطراب بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔

یہ پہلو ذہن میں رکھیے اور ذرا آگے سوچیے۔

ہمارے ملک کی اقتصادی زندگی میں غیر ملکی قرضے بھیانک نتائج کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے وزیرِ تجارت جناب غلام فاروق نے انتہائی دردمندی کے ساتھ کہا: "غیر ملکی قرضوں کے سہارے پر زندہ رہنا آنے والی نسلوں کو غیر ممالک کے ہاتھ رہن رکھنے کے مترادف ہو گا۔" اندازہ لگائیے اس اظہار کے پیچھے کس قدر ہولناک حقائق ہوں گے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ۳۰ جون ۱۹۶۶ء کو غیر ملکی قرضوں کا بار ۱۲ ارب اور ۳۵ کروڑ تک پہنچ چکا ہے۔ ۱۹۶۵ — ۶۶ء میں ہم نے بیرونی قرضوں کی ادائیگی میں زرِ مبادلہ کی آمدنی کا ۱۰۰۸۶ فی صد ادا کیا، حالانکہ ماہرینِ معاشیات کے جائزے کے مطابق جو ملک بیرونی قرضوں کی ادائگی میں زرِ مبادلہ کا سات فی صد ادا کرتا ہے اس کی معیشت سخت خطرے میں ہے۔ غیر ملکی قرضوں سے ہماری صلاحیتِ کار میں جس تناسب سے اضافہ ہوا اور ہم قرضے جن شرائط پر لے رہے ہیں، ان دونوں کے

تقابلی جائزے کے بعد ماہرینِ معاشیات کا کہنا ہے کہ ہمیں چوتھے پانچ سالہ منصوبے کے اختتام تک قرضے ادا کرنے کے لیے زرِمبادلہ کا ایک چوتھائی حصّہ مخصوص کرنا پڑے گا۔ اگر ہم مزید قرضے نہ بھی لیں، تب بھی اس صدی کے آخر، بلکہ اس کے بعد تک قرضوں کی ادائگی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ صورتِ حال حد درجہ تشویش ناک ہے۔ وزیر تجارت نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ ہم اپنی برآمدات میں بے پناہ اضافہ کریں، ورنہ ہمیں غیر معمولی ناخوشگوار صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ذرا اس سے بھی آگے سوچیے۔

بھارت ہمارا دشمن ہے۔ اس نے پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ ہمارے ملک کو ہڑپ کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ ہمارے اور اس کے جنگی وسائل میں ایک اور چار کی نسبت ہے۔ یہی نسبت پاکستان اور بھارت کی برآمدات میں ہے۔ جہاں تک فردی طاقت کا تعلق ہے، انشاءاللہ اہلِ پاکستان، بھارت کی اکثریت پر غالب رہیں گے، لیکن جب جنگی ساز و سامان کا معاملہ آتا ہے، اس وقت دونوں ملکوں کا فرق نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فرق صرف اسی صورت میں کم کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان برآمدات میں بھارت کے قریب قریب آجائے۔ اگر ہم بھارت کے مقابلے میں آدھا زرِمبادلہ کمانے میں کامیاب ہوگئے، تو پھر ہم بھارت کی سامراجیت کا سر کچل کر رکھ دیں گے۔ پندرہ بیس برس تک ہماری خارجہ پالیسی بھارت کی مخالفت کے گرد گھومتی رہے گی۔ وجہ صاف ظاہر ہے، بھارت اپنے شیطانی عزائم سے باز آنے والا نہیں۔ جب تک یہ نسل موجود ہے، وہ تاریخ کے المناک باب دہرانے کی کوشش کرتی رہے گی اور امرِ واقعہ یہ ہے، تو ہمیں کھُل کر قوم کو ایک بڑے خطرے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ عوام میں بھارت کے خلاف بے پناہ جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ اس جوش و خروش کو تعمیری انداز میں بروئے کار لاسکتے ہیں۔ قوم کو بتائیں کہ ہم جب تک بھارت کے برابر یا اس سے آدھا یا اس سے تہائی زرِمبادلہ نہ کمائیں گے، اس وقت تک ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔

ہماری منزل ——— اور ہمارا نعرہ صرف یہ ہونا چاہیے: "برآمد میں اضافہ"

اگر ہم برآمد میں ایک منصوبے کے تحت اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو مشرقی پاکستان کی جائز شکایت اور خدشے دُور ہو جائیں گے، غیر ملکی قرضوں سے جلد نجات مل سکے گی اور بھارت کے لیے جنگی میدان میں آنا آسان نہ رہے گا ـــــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پوری قوم دل و جان سے ایک عظیم مقصد کی تکمیل میں منہمک رہے گی۔

میری حقیر رائے میں ہمیں جنگی بنیادوں پر برآمد میں اضافے کا دس سالہ پروگرام بنانا چاہیے۔ پاکستان کے در و دیوار "برآمد بڑھاؤ" کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ اس پروگرام کے تحت بڑے بڑے جلسے ہوں،،، عام فہم زبان میں لٹریچر تیار کیا جائے، سیاسی کارکن گاؤں گاؤں یہ پیغام لے کر پہنچیں اور تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو کر کام کریں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس عظیم مقصد کے لیے صرف سرکاری مشینری سے کام نہ چلے گا، عوام کے قائدین اور عوام کو اعتماد میں لینا ہو گا۔ اس مسئلے پر عوام میں جوش و خروش اُبھارنا کچھ مشکل نہیں۔ عوامی قائدین یہ اپیل کر سکتے ہیں۔

"اگر تم پاکستان کو بھارت کی جارحیت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہو، تو جہاد کے جذبے کے ساتھ پیداوار میں اضافہ کرو۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ہم بھارت سے بین الاقوامی منڈیاں چھین لیں گے۔ دوسری طرف وہ جس بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں کر رہا ہے، ہم بھی اسی تناسب سے دفاع پر خرچ کر سکیں گے"

یہ اپیل ایک تحریک بن سکتی ہے۔ اس اپیل میں بے پناہ جذباتی کشش ہے، کیونکہ یہ ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔

ہم اپنے قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے ایک گوشوارہ پیش کر رہے ہیں جس سے یہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ ہماری برآمد میں اضافے کی رفتار کیا رہی اور آئندہ پانچ برس میں کیا ہو گی اور ہماری برآمد اور بھارت کی برآمد میں کیا تناسب ہو گا۔

	مشرقی پاکستان			مغربی پاکستان			میزان		
	۱۹۶۰–۶۱	۱۹۶۴–۶۵	۱۹۶۹–۷۰	۱۹۶۰–۶۱	۱۹۶۴–۶۵	۱۹۶۹–۷۰	۱۹۶۰–۶۱	۱۹۶۴–۶۵	۱۹۶۹–۷۰
(و) خام مال									
۱۔ پٹ سن	۸۷	۸۲	۷۵	–	–	–	۸۷	۸۲	۷۵
۲۔ کپاس	–	–	–	۲۰	۳۲	۵۵	۲۰	۳۲	۵۵
۳۔ کھالیں	۴	۴	۴	۳	۳	۴	۷	۷	۸
۴۔ اُون	–	–	–	۸	۹	۹	۸	۹	۹
۵۔ چاول	–	–	–	۵	۱۵	۲۵	۵	۱۵	۲۵
۶۔ مچھلی تازہ اور خشک	۱	۲	۵	۲	۳	۵	۳	۵	۱۰
۷۔ دوسری خام اشیا	۳	۵	۸	۶	۹	۱۵	۹	۱۴	۲۳
میزان	۹۵	۹۳	۹۲	۴۴	۷۱	۱۱۳	۱۳۹	۱۶۴	۲۰۵
(ب) تیار شدہ مال									
پٹ سن	۲۳	۳۵	۸۰	–	–	–	۲۳	۳۵	۸۰
کپاس	–	–	۵	۱۲	۱۸	۳۰	۱۲	۱۸	۳۵
مچھلی (محفوظ)	–	–	۵	۳	۵	۱۰	۳	۵	۱۵
کاغذ	۱	۲	۵	–	–	–	۱	۲	۵
دوسری تیار شدہ اشیا	۱	۷	۲۰	۴	۲۰	۴۵	۵	۲۷	۶۵
میزان	۲۵	۴۴	۱۱۵	۱۹	۴۳	۸۵	۴۴	۸۷	۲۰۰
کل میزان	۱۲۰	۱۳۷	۲۰۷	۶۳	۱۱۴	۱۹۸	۱۸۳	۲۵۱	۴۰۵

(رقوم کروڑوں میں ہیں)

اس وقت بھارت کے زرِ مبادلہ کی آمدنی تقریباً ۸۵۰ کروڑ ہے، یعنی پاکستان سے چار گنا زیادہ۔ ۱۹۷۰ء میں ہماری زرِ مبادلہ کی آمدنی ۴۰۰ کروڑ اور بھارت کی ۱۲۰۰ کروڑ کے لگ بھگ، یعنی نسبت ۱ : ۳ کی ہو گی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد بھارت کے زرِ مبادلہ میں اضافہ بہت کم ہو سکے گا، کیونکہ اس کی صلاحیتِ کار اس نقطے کے قریب پہنچ جائے گی جس کے بعد اضافہ معمولی سا ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ دس برسوں میں ہماری زرِ مبادلہ کی آمدنی بھارت سے نصف ہو سکتی ہے۔

اوپر دیے ہوئے گوشوارے سے آپ یہ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی برآمد میں زیادہ فاصلہ نہ رہے گا۔ اگر مغربی پاکستان میں کپاس اور چاول کی پیداوار دُگنی کر دی جائے تو یہاں کی زرِ مبادلہ کی آمدنی مشرقی پاکستان کے برابر ہو جائے گی۔ پچھلے سال کپاس کی برآمد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، تھوڑی سی توجّہ سے یہ اضافہ دوچند ہو سکتا ہے۔

بھارت کی زرِ مبادلہ کی آمدنی کو نشانہ (TARGET) بنانے سے پوری قوم کی توجّہ ایک نقطے پر مرکوز رہے گی۔ پھر ہم یہ دیکھنے کے بجائے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان نے کتنا زرِ مبادلہ کمایا، یہ دیکھیں گے کہ پاکستان کے زرِ مبادلہ میں کتنا اضافہ ہوا اور منزل کتنی دُور اور رہ گئی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے چند باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔

اگر یہ ممکن ہو سکے، تو صدرِ پاکستان اور وزیرِ خزانہ مہینے میں ایک بار مشرقی پاکستان ضرور تشریف لے جایا کریں۔ صدر صاحب کے بار بار آنے جانے سے باہمی مفاہمت کی فضا پیدا ہو گی۔ وہاں کے لوگ ایک حد تک یہ محسوس کریں گے جیسے صدرِ پاکستان انہی کے ہیں۔

بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے، مگر اس کی اہمیّت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بے پناہ مصروفیت کے ہوتے ہوئے قائدِ اعظمؒ سخت مخدوش حالات میں مشرقی پاکستان تشریف لے گئے۔ کہتے ہیں اُس وقت پاکستان کے پاس ہوائی جہاز بہت پرانا اور تکلیف دہ تھا۔ وہ نو دس گھنٹوں میں ڈھاکہ پہنچے۔ مشرقی پاکستان کے دُور دراز علاقوں سے لاکھوں پاکستانی قائدِ اعظمؒ کو دیکھنے کے لیے آئے۔ عجب جوش و خروش کا عالم تھا۔ بابائے قومؒ نے فرمایا۔

"میں یہاں اس بار ہفتہ عشرہ کے لیے آیا ہوں، لیکن سربراہِ ریاست کی ذمّے داریاں ادا کرنے کے لیے میں یہاں دنوں اور ہفتوں ٹھہرا کروں گا۔ اسی طرح پاکستان کے وزراء کو یہاں کے عوام سے گہرے روابط قائم کرنے چاہییں۔"

آپ نے دیکھا قائدِ اعظمؒ کی ژرف بینی نے اس تلخ نفسیاتی فضا کو پہلے ہی بھانپ لیا جو بعد میں جغرافیائی

فاصلے اور قائدین کی بے احتیاطی سے پیدا ہوئی۔ انہوں نے حل بھی بروقت پیش کر دیا۔ اگر ہم قائداعظمؒ کی اس تاریخی تقریر کو مشعلِ راہ بنا لیتے، تو مشرقی پاکستان میں وہ احساسات پیدا نہ ہوتے جو تکلیف دہ بھی ہیں اور تشویش ناک بھی۔ مجھے اندازہ ہے کہ صدرِ پاکستان کے ہر ماہ ڈیڑھ ماہ بعد مشرقی پاکستان جانے سے بہت سی انتظامی دشواریاں پیدا ہوں گی، لیکن اگر تدبّر اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے، تو چند مہینوں کے بعد راستہ صاف ہو جائے گا۔ جب صدرِ پاکستان مشرقی پاکستان تشریف لے جائیں تو وہ اپنے ہمراہ مشرقی پاکستان کے متعلق وہ فائلیں لے جا سکتے ہیں جن پر وہاں کے متعلقہ لوگوں سے گفتگو کر کے فوری فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طریقِ کار سے بہت سے اہم معاملات غیر ضروری تاخیر سے محفوظ رہیں گے اور قیادت پر عوام کا اعتماد زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

پاکستان کے سربراہ کی ذمے داری دوسرے ممالک کے سربراہوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ زبان کے اختلاف نے مسائل خاصے پیچیدہ بنا دیے ہیں۔ میری ناقص رائے میں صدرِ محترم کو مشرقی پاکستان سے شائع ہونے والے اخبارات کے اداریے پورے کے پورے پڑھنے چاہییں۔ ایسی مشینری قائم کی جائے جو بنگلہ اخبارات کے اداریے روز کے روز انگریزی یا اردو میں منتقل کر دے۔ اداریوں کی تلخیص بعض اوقات غلط تاثر قائم کر جاتی ہے اور غلط تاثر کے اثرات بہت دُور تک جاتے ہیں یا جا سکتے ہیں۔ ماضی میں غلط تاثر کی بنیاد پر غلط فیصلے ہوتے رہے، جو مشرقی پاکستان میں اضطراب پھیلانے کا سبب بنے۔

مشرقی پاکستان کے بارے میں کوئی بات کہنے یا فیصلہ کرنے سے پہلے لوگوں کے نفسیاتی مزاج پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ بعض باتیں دلائل کے اعتبار سے بہت مضبوط نظر آتی ہیں، لیکن ان کے خلاف شدید عوامی ردِ عمل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں نفسیاتی سلیقے کے ساتھ نہیں کہی جاتیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے بعض مسائل ایسے ہیں جن پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان میں جس قدر تاخیر ہوگی، اضطراب پھیلتا رہے گا اور بعض معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں جلد بازی

سے کام نہ لیا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ بعض اوقات دونوں قسم کے مسائل خلط ملط ہو جاتے ہیں نتیجہ ظاہر ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ دونوں بازوؤں کی مشترک دینی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کام میں سب کا تعاون حاصل کیجیے اور ان تمام تحریکوں کا حوصلہ بڑھائیے جو سب عظیم مقصد کے لیے خلوص سے کام کر رہی ہیں۔ صرف ایک احتیاط درکار ہے۔ اچھے کاموں کے لیے نیک نام لوگوں کو آگے لائیے۔ اگر ایسے اصحاب چُنے گئے جن کے متعلق عوام میں پہلے سے شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں، تو پھر اچھے کام بھی کشش کھو بیٹھیں گے۔